وہ
اور
میں

وہ اور میں



دلآویز خاکوں اور
یادداشتوں کا حسین مجموعہ

فضل الرحمن نعیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مِرے رفیق مرے غمگسار ہیں لیکن

کبھی ٹھکانہ مرا کچھ کبھی پتہ اور

(راہی)

اُن لوگوں

کے لئے

جنہیں شگفتہ تحریریں

بہت پسند ہیں۔

پہلا ایڈیشن

مارچ ۱۹۸۰

تعداد ۹۹۹+ ۱۰۱

حقوق — بحق مصنّف

ناشر — رائٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان

کتابت — علیم الدین

مطبع — شرکت پرنٹنگ پریس لاہور

سول ایجنٹ — رائٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان
۴۷ لکشمی مینشن شاہراہ قائداعظم لاہور

ٹائیٹل — فضل الرحمٰن نعیم

قیمت — ۳۰ روپے

ناداروں، بیماروں
بے کاروں کیلئے
براہ راست منگوانے
کی صورت
میں نصف قیمت

لفظ پر پیش

میں اکثر سوچتا ہوں کہ کتابوں کے ابتدائی صفحات پر درج پیش لفظ کے معنی کیا ہیں۔ مگر آج تک اس ترکیب کی حقیقی نوعیت میں نہیں سمجھ سکا جو یقیناً میری نادانی پر دلالت کرتی ہے۔ دوسری بات یا معمہ جو آج کل مجھے درپیش ہے وُہ یہ ہے کہ ادبی مجاوروں نے اب کتابوں کو دُلہن بنا کر، ان کا سولہ سنگھار کر کے رونمائی کرنے کرانے کی جو بدعت شروع کی ہے۔ اس کی افادیت کیا ہے اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے۔ چلو مان لیا کہ مصنّف کا تعلق اگر اس گروپ سے ہو۔ جسے درحقیقت دُلہن بننے کی آرزو تھی یا آرزو ہے۔ یعنی وہ مصنّف ہونے کے ساتھ ساتھ مصنفہ ہے اور اس نے اپنی تصنیف کو میک اَپ کر کے سلمہ ستارہ اور گوٹا لگا کے اپنے ارمان پورے کرنے کے لئے اس کی رُونمائی کرا دی اور احباب سے " اللہ نظرِ بد سے بچائے " کہلوا کر سلامیاں وصُول کر لیں تو کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں۔ مگر وہ حضرات جو ماشاء اللہ شکل و صورت کے لحاظ سے جوالمرد ہیں۔ جب اِن نازنینوں، مہ جبینوں کی کورانہ تقلید میں اپنی کتابوں، سفرناموں اور مجموعہ ہائے کلام کی رونمائی کرانے کا اعلان کرتے ہیں تو میرا دِل چاہتا ہے کہ ایسی کتابوں کے آغاز میں پیش لفظ کے بجائے پیش لفظی لکھ دوں کہ رونمائی سے ان کی کوئی تو مناسبت ہو جائے۔

ایک اور خلش بھی میری فکر اور سوچ میں موجود ہے کہ اخبارات و جرائد میں کتابوں کے تبصرے کا کالم جس ذی فہم نے شرُوع کیا ہو گا۔ یقیناً اس نے اہلِ قلم حضرات پر احسان کیا ہو گا۔ اور اس کا اصل مقصد اس " موجد " کے ذہن

ہیں یہ ہوگا کہ اس طرح ان کی مشکلات میں خاصی کمی واقع ہوگی اور کتابوں کی خریداری بڑھ جاتی گی۔ مگر آج ہو یہ رہا ہے کہ قلمکار حضرات جب کسی نہ کسی طرح اپنی کاوش کو کاغذی پیراہن کی شکل دینے میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد اس کے دو دو نسخے (شکر ہے چار چار نہیں) اخبارات و جرائد کو بھیج دیتے ہیں تو ان کیلئے لازمی ہو جاتا ہے کہ وہ روزانہ نہیں تو ہفتے میں ایک بار چار سطری تبصرہ لکھنے والوں سے ذاتی رابطہ قائم کر کے ان کو یاد دہانی کرواتے ہیں تاکہ تبصرہ نگار اس تصنیفِ لطیف سے ہی نہیں اس عظیم لکھاری سے ہی الرجک ہو جائیں۔ اس باہمی ربط اور مسلسل "آنے جانے" کے نتائج بالعموم مصنفین کے حق میں بے حد ہولناک ثابت ہوتے ہیں کہ اوّل تو ان کے بھجوائے ہوئے دونوں نسخے کسی پنساری کے ہاتھ لگ جاتے ہیں یا پھر تبصرہ چھپتا ہے تو مصنف بے چارہ سر پیٹنے کے علاوہ اس روز اپنے تمام بچوں کو بھی پیٹ ڈالتا ہے یا تبصرہ اس وقت شائع ہوتا ہے جب اس نام کی کوئی تصنیف مارکیٹ میں نہیں ہوتی۔ رُونمائی ہونے کے بعد وہ کئی بچوں کی ماں بن چکی ہوتی ہے یا ردّی کے قبرستان میں کب کی دفن ہو چکی ہوتی ہے۔

فضل الرحمٰن نعیم

اللہ تبارک وتعالیٰ

خالقِ کائنات کا سب سے بڑا کرم مجھ ایسے حقیر انسان پر یہ ہے کہ میں جب چاہوں، جس وقت چاہوں، جس حال میں چاہوں، اس کے حضور حاضری دینے، اسے اپنی التجا سنانے اور اکثر حالات میں اس سے اپنی بچگانہ ضد منوانے پر قادر رہوں، اس کی ۹۹ صفات میں بہت بڑی تعداد کا تعلق رحمت و بخشش، جود و سخا، چشم پوشی اور ستاری، کرم کرم اور کرم سے ہے اور جو چند صفات قہاری و جبروتی ہیں بھی ان میں بھی بنی آدم کے لئے دردمندی و احسان عظیم کا جذبہ بدرجہ اتم نظر آتا ہے

میرے رب کی ایک اور شان جو مجھے بے حد پسند ہے وہ یہ ہے کہ وہ کسی ایک مذہب، مسلک، فرقے یا گروہ کا رب نہیں اور اس کی عنایات محض کسی ایک مخصوص طبقہ سے ہی وابستہ یا محدود نہیں ہیں بلکہ وہ رب العالمین ہے جو تمام جاندار اور بظاہر بے جان اشیاء کی دیکھ بھال غور و پرداخت اور ان کی پرورش کے سامان کرتا ہے.

ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت اس کی یہ ہے کہ اسے بشریت کے خواص خطا و نسیان کے باوجود آدم اور اس کی اولاد کی تخلیق پر فخر ہے اور اس نے انسان کامل کو فرشتوں پر ترجیح اور بلند مرتبہ عطا کیا ہے اسی طرح اس نے بندے کو یہ اختیار بھی دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو ابلیس رجیم سے بھی آگے قدم بڑھا سکتا ہے. ان دونوں، سلسلوں — رحمانی اور شیطانی کے اختیار کرنے یا ان کو چھوڑ دینے پر کوئی جبر نافذ

نہیں کرتا۔ اور بندوں کو مکمل اختیار دیتا ہے کہ وہ چاہیں تو راہِ ہدایت پر چلیں اور اگر چاہیں تو شومئی قسمت سے بدی اور بے حیائی کو اپنا لیں۔

اپنے نیک بندوں پر وہ بے پایاں مسرت کا اظہار کرتا ہے جب کہ بد کردار بد خصلت انسانوں کو باخبر کرتے ہوئے گہرے رنج و غم سے ان کے ہولناک انجام کی اطلاع دیتا ہے۔

میرا رب وہ ہے جس پر کسی کی اجارہ داری نہیں جس کے دروازے ہر وقت کھلے ہیں جو جب چاہے جس وقت چاہے تقدیر کو مٹا سکتا ہے مٹا دیتا ہے اور نئی تقدیریں بنا دیتا ہے۔ انسان کی مایوسی اسے پسند نہیں اسی لئے خودکشی کو اس نے حرام قرار دیا ہے کہ یہ توکل کے خلاف ہے۔ کسی اِنسان کو وہ یہ اختیار نہیں دیتا کہ وہ آدم کے دوسرے بیٹوں کے حقوق غصب کرے۔ رزق میں کشائش والوں کو اس کا حکم یہ ہے کہ ضرورت مند بھائیوں کی امداد دل کھول کر یوں کرو کہ تمہارے جسم کو بھی اس کی خبر نہ ہونے پاتے۔ تدبیر اور تقدیر دونوں اس کے خادم اور کارکن ہیں اس کی مرضی و منشاء کے خلاف کوئی واقعہ ظہور پذیر نہیں ہو سکتا وہ قادر و قدیر اور توانا ہے اور بے حد رحم و کرم کرنے والا ہے، تو یہ قبول کرتا ہے۔ اپنی چادر رحمت اور محبت بھری آغوش کو وا کئے ہر لمحہ اپنے بندوں کا منتظر رہتا ہے۔

احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین

نبی اکرم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم دُنیا بھر کے انسانوں کے محسنِ اعظم ہیں وہ اپنے رب کریم کی صفاتِ حسنہ کے مکمل عکس جمیل و جلیل ہیں۔ وہ رَبُّ العالمین ہے تو آپ رحمۃً للعالمین ہیں۔ آپؐ پر بھی کسی مذہب گروہ یا فرقے کی اجارہ داری نہیں ہے۔ خدا کے نیک بندوں کے آپؐ محبوب و رہنما ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی آپ شفیع المذنبین بھی ہیں۔ خدا کی پیدا کردہ وسیع ترین کائنات کے ہر گوشے اور چپے چپے میں بسنے والی مخلوقات جن میں انسان چرند پرند حیوانات، اور جمادات سبھی شامل ہیں محمد مصطفیٰؐ کی شان اقدس والا صفات میں درود اور سلام کا نذرانہ پیش کرنے پر اس لئے مجبور ہیں کہ ان کی ہستی، ان کا عدم سے وجود میں آنا۔ بڑھنا پھلنا اور پھولنا وغیرہم سبھی مدارج حیات آپؐ کی طفیل اور آپؐ کا احسانِ عظیم ہے۔

آپؐ کا دِل انسانوں کی ہمدردی، خیر خواہی اور ان کی محبت سے لبریز ہے آپ کے سینے میں ماں سے زیادہ شفقت ہے۔ بندوں کی حالت غم کو دیکھ کر آپؐ کی آنکھیں اشکبار ہیں بنی آدم پر رحمت و شفقت ہی کا وُہ جذبہ تھا جس کی بدولت طائف کے سنگ دل انسان آپ کو لہولہان کرنے کے باوجود انتہائی عقوبت سے بچ گئے۔ ہندہ جیسی مکار عورت آپؐ کی امان میں آئی تو دینوی و اخروی نعمتوں کی سزاوار ہوئی۔ حبشہ کا ایک کالے رنگ کا انسان جس کا عربی تلفظ

تک صحیح نہ تھا اور جو اَشْھَدُ کے بجائے اَسْھَدُ کہا کرتا تھا آپؐ کے دامن کو تھام کر حضرت بلالؓ بن گیا جس کی تعظیم کے لئے زمین پر امیر المؤمنین حضرت عمرؓ اٹھنے پر مجبور ہوئے تو آسمان پر اس کی اذان سُن کر فرشتے وجد میں آنے پر۔

خدا کا وہ رسُول جس کے خاکِ پا پر دنیا کی تمام بادشاہتیں قربان ہیں، یتیموں، اسیروں اور غریبوں کا اس حد تک ہمدرد اور بہی خواہ تھا کہ اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ "جب میں دُنیا سے رُخصت ہوں تو غریب و بے زر ہونے کی صورت میں"۔ دُنیا کی تمام آسائشیں اور اموال آپ کے قدموں میں ڈھیر کیا گیا مگر آپؐ نے اس کی طرف نظر اُٹھا کے نہ دیکھا۔ یہ رحمتِ مجسّم، محبت کا انمول خزانہ اور شفقتوں کا لامتناہی سِلسلہ ہمارا محسنِ اعظم ہے جس پر درود بھیجنا دنیا میں فلاح و ترقی کا ذریعہ بنتا ہے اور آخرت میں نجات کا۔ اللّٰھم صَلِّ علیٰ محمد فی ہذہ الدنیا و بعث الثانی ؎

اتالیق

میرے والد مکرم ماسٹر عبدالرحمٰن اتالیق کا تعلق ماجھے کے علاقے بابا بکالہ ضلع امرتسر سے ہے جو سکھوں کے ایک متبرک مقام اور بہت بڑے گوردوارے کی وجہ سے دُور دُور تک شہرت کا حامل ہے یہاں ہر سال میلہ لگا کرتا تھا جس میں بہت رونق ہوا کرتی تھی۔ سکھ ہزاروں کی تعداد میں اس میں شرکت کرتے تھے۔ پنجابی کی بولیاں ماہیا اور اور لوک گیت الاپے جاتے اور ہر طرف تھیٹر تماشے دکھائے جاتے۔ بابا بکالہ میں لیتہ الف اور بستہ ب کے بدمعاش، نامور ڈاکو اور بہترین شمشیر زن رہتے تھے۔ قصبے کی زیادہ آبادی سکھوں پر مشتمل تھی۔ صرف چند گھرانے مسلمانوں کے تھے۔ جن میں ہمارا خاندان علاقے بھر میں اپنے علم و فضل اور قانون دانی کی بنا پر بے حد معزز اور مؤقر گردانا جاتا تھا۔ میرے دادا غلام قادر کا عین عنفوانِ شباب میں جب کہ میرے ابا کی عمر چار سال اور میری پھوپھی کی عمر دو ڈھائی سال کی تھی۔ انتقال ہو گیا۔ راجپوتوں کی رسم کے مطابق کہ ان کی بہو کسی اور گھر میں نہیں جا سکتی۔ میری دادی اماں جن کی عمر بیس بائیس برس سے زیادہ نہ تھی۔ ہمارے ابا کے تایا یعنی ہمارے بڑے دادا کے نکاح میں آ گئیں جن کا اسمِ گرامی منشی عبدالقادر تھا۔ ان کے ایک اور حقیقی بھائی عبدالغفور تھے جو بے حد خلیق اور بہادر انسان تھے۔ منشی عبدالقادر بہترین قانون دان اور عالم فاضل انسان تھے شرفاء تو ان کی عزت و تکریم اپنا فرض سمجھتے تھے۔ لیکن لیتہ الف اور لیتہ ب کے وہ بدمعاش جو انگریزوں کی سخت حکومت کے باوجود کسی بڑے سے بڑے افسر کو خاطر میں نہ لاتے تھے منشی عبدالقادر سے خوف کھاتے تھے اور ان سے ہر طرح ادب و لحاظ سے پیش آتے تھے۔ ان کے اس رعب کی وجہ سے حکومت کے کارندے پکڑ دھکڑ، گرفتاریاں اور چھاپے مارنے سے قبل ان سے

مشورہ ہی نہیں اجازت لینا ضروری خیال کرتے تھے بابا بکالہ کے قریب ریلوے اسٹیشن لگتا تھا وہ بیاس کا سٹیشن تھا جس کا نام دریائے بیاس کی مناسبت سے رکھا گیا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر جالندھر واقع تھا۔ ڈاکہ زنی کی دلیرانہ وارداتوں کا ارتکاب ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ جو سواریاں بیاس سے اترتی تھیں اور انہیں نواحی دیہات و قصبات میں جانا ہوتا تھا ان میں سے بہت کم صحیح سلامت اپنے گھروں تک جاتی تھیں۔ ہماری دادی اماں کی روایت ہے کہ وہ شام کے وقت دو تین مرتبہ بیاس یا رعیہ سے بابا بکالہ کے لئے روانہ ہوئیں ہر بار راستے میں پیشہ ور ڈاکوؤں نے انہیں روکا اور ان کا زیور اتارنا چاہا مگر جب میں انہیں یہ بتاتی کہ میرا تعلق منشی عبدالقادر کے خاندان سے ہے تو وہ فوراً مؤدب ہو کر کھڑے ہو جاتے اور مجھے بحفاظت گھر پہنچانے کا بندوبست کرتے۔

اس قسم کے دنیوی ماحول میں میرے ابا نے آنکھیں کھولیں مگر والدہ کی تربیت کی وجہ سے انہوں نے ماحول کا کوئی اثر قبول نہ کیا۔ ان کے چار ماموں تھے، فیروز الدین، حسام الدین، اعظم دین المعروف محمد اعظم اور محمد دین ۔ ہماری دادی ان کی اکلوتی بہن تھیں۔ یہ چاروں بھائی پنڈوری وینساں ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے سب سے بڑے بھائی فیروز الدین سفید پوش تھے، حسام الدین زمینوں کے نگران ، محمد اعظم شاید سرکاری ملازم اور حکیم محمد دین طبیہ کالج دہلی کے فارغ التحصیل بہترین نباض اور ماہر طبیب تھے۔ یہ گھرانہ دین سے گہرا لگاؤ رکھتا تھا قرآن حکیم، حدیث، فقہ، اور دیگر علوم و فنون سیکھنے کے لئے لوگ ان سے رجوع کرتے تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹے حکیم محمد دین بعد ازاں ہمارے نانا بنے اور طویل مدت تک مجھے بھی ان کی نیک صحبت میں بیٹھنے اور ان سے دین و حکمت سیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی اپنے

ننھیال کی نیکی اور مذہب سے والہانہ عقیدت کا اثر قبول کرتے ہوئے میرے ابا انتہائی صابر شاکر، محنتی، دیانت دار، عبادت گزار اور متوکل انسان کی شکل میں ڈھل گئے۔ اپنے باپ کی شاید ہر کوئی تعریف کرتا ہے یا اسے کرنی چاہیئے لیکن یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ منحنی اور چند کھڑکھڑاتی ہڈیوں پر مشتمل جسم کے اس انسان میں مستقل مزاج اور ان تھک محنت کرنے والے ایسے کل پُرزے نصب ہیں جن میں توکّل و استغنا کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے میرے بڑے چچا عبداللہ خاں جن دنوں فوج میں تھے اور دُوسری جنگ عظیم میں مشرق وسطےٰ میں تھے کہ ابّا بے حد بیمار پڑ گئے۔ لاغر تو وہ پہلے سے ہی تھے۔ طویل بیماری نے رہی سہی کسر بھی نکال دی۔ گھر میں فاقے آنے لگے میری والدہ مرحومہ اُمتہ اللہ بیگم نہایت سلیقہ شعار، ہنس مُکھ اور تکالیف کو چٹکیوں میں اڑانے پر قادر خاتُون تھیں انہوں نے اپنی تکلیف کا کسی کو پتہ نہ چلنے دیا۔ ورین اثنا ایک بہُت بڑے مالدار اور سرمایہ دار نے جس کے بچوں کو ابا پڑھایا کرتے تھے۔ سات تولے سونا ابا کو بھجوایا کہ یہ بطور صدقہ ہم دینا چاہتے ہیں۔ سات تولے سونا ان دنوں آج کل کے حساب سے اتنی مالیت کا ہے جیسے کسی کو اچانک گلبرگ میں چار پانچ بیڈ کی کوٹھی الاٹ ہو جائے۔ مگر گھر میں شدید فاقوں کی موجُودگی میں ابا نے یہ سونا لینے سے معذرت کر دی۔ اس واقعہ کے عین دوسرے روز چچا عبداللہ خاں کا عراق سے پندرہ روپے کا منی آرڈر موصول ہوا جس نے بھُوک سے دَم توڑتے ہوئے ہمارے گھر کو پھر سے نئی زندگی حاصل کرنے میں اہم اور ناقابلِ فراموش کردار ادا کیا میرے والد خدا کے فضل و کرم سے حیات ہیں جب کہ ہمارے چچا چند سال قبل وفات پا گئے ہیں۔ لیکن منی آرڈر کے اس واقع کو وہ ہمیشہ یاد کر کے اپنے محسن چھوٹے بھائی کے لئے دُعا گو رہے ہیں کسی کے چھوٹے سے احسان کو نہ بھولنا ہمارے ابا کی ایک اور قابلِ ذکر خصُوصیت ہے۔

ہمارے دادا کی اچانک اور کربناک وفات کے بعد ابا سکول میں اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے" تاہم جتنا عرصہ وہ سکول جاتے رہے طلباء و اساتذہ کی نظروں میں اہمیت کے حامل رہے ان کے ایک استاد انہیں دیکھ کر برجستہ کہا کرتے تھے کہ ان کے جسم کو نہ دیکھو کارناموں کو دیکھو

۱۹۴۷ء میں جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا اور مجھے پاکستان بھجوا دیا گیا انہی دنوں میرا سب سے چھوٹا بھائی انعام پیدا ہوا زچگی کے ایام میں ہی میری والدہ کو پاکستان آنا پڑا۔ راستے کی بے پناہ صعوبتوں کی بنا پر وہ بیمار پڑ گئیں اور جب لاہور پہنچیں تو بے ہوش تھیں۔ ابا نے میری تلاش شروع کر دی جب میں ان سے ملا تو والدہ مرحومہ بے ہوشی کی حالت میں حضرت داتا صاحب کے عقب میں واقعی ایک ہسپتال میں (جہاں کوشش بسیار کے بعد جگہ ملی تھی) داخل کروائی جا چکی تھیں۔ جب میں ہسپتال میں پہنچا تو ڈاکٹر ان کی زندگی سے اور اِن کے ہوش میں آنے سے مایوسی کا اظہار کر چکے تھے۔ خدا کی قدرت اور اس کی شان ہے کہ اِدھر میں کمرے میں داخل ہُوا اِدھر انہوں نے آنکھیں کھول دیں "میرا بیٹا فضل مِل گیا" "اللہ کا شکر ہے" یہ کہتے ہوئے مجھے اپنے سینے سے لگایا اور ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں" انا للہ و انا الیہ راجعون" ان کو میانی صاحب کے قبرستان میں بکس میں بند کر کے دفن کیا گیا مگر اُن کی قبر کے نشانات بعد ازاں کبھی نہ مِل سکے کہ اِن دنوں مہاجرین کے قافلوں میں موت زندگی سے کہیں زیادہ ارزاں تھی اس عظیم صدمے کو ہمارے ابا نے جس کمال صبر و تحمل سے برداشت کیا وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ گھر رہا نہ گھر والی رہی۔ بے آسرا بے سہارا مگر ایک لفظ بھی شکایت یا پریشانی کا ان کی زبان سے نہ نکلا۔ میرے علاوہ چار پانچ بہن بھائی چھوٹے چھوٹے بے ماں کے رہ گئے سب سے چھوٹا جو بیس بائیس روز کا تھا وہ ہماری دادی اماں نے سنبھال لیا وہ بھلا چنگا دو سال کا ہونے کے بعد اپنی والدہ سے جا ملا۔ اور اس کے بعد تو جُدا ہونے والے بہن بھائیوں کی ایک لائن

لگ گئی سب سے آخر میں ہمارا جواں سال بھائی حبیب الرحمٰن طاہر جو ایف اے میں پڑھتا تھا ہم سے اچانک جدا ہوا۔ صدمات کے اس طومار میں ابا نے سوائے انا للہ کہنے کے اور کچھ نہ کہا حالانکہ ان کے دل کی حالت ان کے چہرے سے عیاں ہوتی۔ وریں اثنا ہمارے پرخلوص نانا حکیم محمد دین اور بے حد محبت کرنے والی نانی اماں حمیدہ بیگم نے ہمارے از حد محترم اور شفیق ماموں حکیم عطاء الرحمٰن سے مشورہ کرنے کے بعد ہماری خالہ امتہ الہادی رشیدہ جو عمر میں ابا سے کئی سال چھوٹی اور میرے سے صرف سات آٹھ سال بڑی ہیں ابا کے نکاح میں دے دیں۔ اور یوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (فداہ ابی و امی) کا یہ فرمان کہ "الخالۃ والدۃ" میرے اور میرے بہن بھائیوں کے لئے حقیقی اور عملی رنگ میں بھی پورا ہوا۔ ہماری ان خالہ نے ہم سب بچوں کو بے حد محبت و شفقت سے پالا اور اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے انہیں دینی و دنیوی و اخروی نعمتوں سے سرفراز کیا۔ پہلی والدہ سے اب ہم دو بھائی ہیں۔ چھوٹا بھائی عزیزم لطف الرحمٰن خالد سلمہ ہے جب کہ ہماری خالہ سے عزیزم خلیل الرحمٰن، انعام الرحمٰن، حبیب الرحمٰن غوری اور ایک بہن امتہ الرؤف خدا کے فضل سے بقید حیات ہیں۔ ہماری بہن امتہ القیوم طاہرہ زوجہ وسیم احمد خاں جو ہماری خالہ کے بطن سے تھیں اور ان بچوں میں سب سے بڑی تھیں تین سال قبل صرف پچیس سال کی عمر میں اپنا ایک بچہ شمیم احمد خاں یادگار چھوڑ کر اپنے مولائے حقیقی کے پاس چلی گئیں۔ ابا کی طویل زندگی میں خوشیوں اور غموں کے جو ریلے آتے وہ ان کے پائے ثبات و استقلال میں لغزش پیدا کرنے پر قادر نہ ہوتے اور آج جب کہ ہم ان کے بچے کام کاج سے اکتا جاتے ہیں اور تھکن محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ہڈیوں کا یہ مجموعہ برابر اپنے کام میں مصروف دکھائی دیتا ہے۔ ان کی عبادت، ریاضت محنت مشقت، دیانت اور دیگر خوبیوں کو دیکھ کر میں ہمیشہ شرم کے مارے سر جھکا لیتا ہوں کہ میرے اندر ان خوبیوں کا عشر عشیر بھی نہیں۔

پرائمری پاس کرنے کے بعد ابا سکول سے اٹھ گئے تاہم وہ اس قدر ذہین اور

قابل تھے کہ سکول میں پڑھنے والے ان کے سینئر اور جونیر طلباء حساب پڑھنے کے لئے ان کے پاس آتے رہے وریں اثنا انہوں نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا بعد ازاں اپنی خداداد قابلیت اور خدا کے بھروسے پر محض دو ماہ میں منشی فاضل کی تیاری کر کے امتحان دے دیا اور اس میں بھی کامیابی حاصل کی۔ پاکستان بننے کے بعد جب وُہ ڈی بی ہائی سکول جامکے چیمہ (سیالکوٹ) میں بطور مدرس کام کرنے لگے تو حساب میں اِن کی خصوصی دلچسپی اور قابلیت کی بنا پر منشی فاضل ہونے کے باوجود مڈل کلاسز کا حساب دیا گیا۔ سکُول کے سالانہ معائنہ کے موقع پر ہر بار انسپکشن ٹیم نے یہ ریمارکس دیئے کہ His SECTION IS BETTER THAN THE OTHERS حساب کے اُلجھے ہوئے سوالات کو حل کرانے کے لئے نہ صرف طلباء ان سے رہنمائی حاصل کرتے رہے بلکہ کئی نامور حساب دان اساتذہ کو بھی میں نے ان کی معاونت طلب کرتے بارہا دیکھا۔ میرا ذاتی خیال یہ ہے اور یہ بات میں کسی مصلحت یا رشتے کے تقدس کی بناء پر نہیں کہہ رہا کہ برصغیر میں ان کے پائے کا حساب دان اس دور میں کوئی دوسرا پیدا نہیں ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کی یہ قابلیت جنگل کے پھُول کی خوشبو بن گئی۔

میں نے ذکر کیا ہے کہ ابا میں صبر و تحمل اور برداشت کی قوّت حیرت انگیز حد تک پائی جاتی ہے تاہم جب کبھی معاملہ حد سے بڑھ جاتے تو اِن کے مختصر الجم جسم سے شیر جیسی دہاڑ سننے میں آتی ہے جسے سُن کر بڑے بڑے پہلوانوں کا پتّہ پانی ہو جاتا ہے۔ ویسے اکثر و بیشتر ان کا معمُول یہ ہے کہ وہ اپنی بات منوانے کے لئے پہلے اپنے عمل سے دلائل دیتے ہیں۔ پھر نہایت خوش سلیقگی سے نرم زبان استعمال کرتے ہیں۔ جب ہم مہاجرین کی صورت میں سیالکوٹ کے ایک گاؤں ڈنڈ پور کھرولیاں گئے تو ایک روز سمبڑیال سے ایک تھانیدار اور چند سپاہی مہاجرین کے کوائف جمع کرنے کے لئے آئے۔ پاکستان بننے سے جہاں پنجاب کے کسانوں کو سُود خور ہندو بنیوں سے عمر بھر کے لئے نجات ملی وہاں ایک اور تبدیلی لوگوں میں یہ آئی کہ اکثر خاندانوں

نے اپنی ذات کو اُونچا کرنے کے لئے ایسی دروغ گوئی سے کام لیا جو بعدازاں ابدی صداقت بن گئی۔ چنانچہ یہاں بھی اکثر مہاجرین نے اپنے آپ کو راجپوت بتایا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جب ابا اس کے سامنے گئے وہ تھانیدار لفظ راجپوت شاید بُری طرح سیر ہو چکا تھا۔ کہنے لگا کیا ہندوستان میں سب راجپوت بستے ہیں۔ کہ جو آتا ہے اپنی ذات راجپوت بتاتا ہے۔ ابا کہنے لگے۔ ایک منٹ ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں۔ ہندوستان سے ہم جن حالات میں آتے تھے۔ ان کا تذکرہ میں نے کیا ہے۔ میری والدہ موت و حیات کی کش مکش میں مبتلا تھیں۔ سوائے تن کے کپڑوں کے اور ایک برتن کے جو بعد میں کہیں کھو گیا۔ کچھ بھی وہاں سے لایا نہ جا سکا تھا۔ البتہ ابا نے جو کوٹ پہنا ہُوا تھا اس میں چند روز قبل ایک ضروری کام سے ٹرنک سے نکالی جانے والی ابا کی میٹرک کی سند پڑی تھی۔ جس کو واپس ٹرنک میں رکھنے کی مہلت نہ مل سکی تھی۔ اس سند کی پشت پر جیسا کہ ان دنوں دستور تھا ابا کا گاؤں، ذات اور چند دیگر کوائف درج تھے۔ ابا گھر گئے اور کوٹ کی جیب سے وہ سند لے آتے اور سو ڈیڑھ سو افراد کے اجتماع میں تھانیدار سے کہنے لگے کہ کیا کچھ پڑھے لکھے ہو یا نہیں، وہ اس سوال پر بڑا جز بز ہوا۔ آپ نے سند اس کے سامنے رکھی اور کہنے لگے کہ دیکھو پاکستان آج بنا ہے میں نے قیام پاکستان سے پچیس تیس برس قبل میٹرک کا امتحان پاس کر کے یہ سند لی تھی۔ اور اس پر اپنا قصبہ بابا بکالہ، والد کا نام غلام قادر اور ذات راجپوت لکھوائی تھی۔ اگر ہم راجپوت بنے بھی ہیں تو پاکستان بننے سے کم از کم نصف صدی قبل بنے ہیں آج نہیں۔ اس لئے یا تو تم اپنے الفاظ پر معذرت کرو یا پھر میرے بزرگوں کو ولی تسلیم کرو جنہیں پچاس برس قبل یہ یقین تھا کہ ایک تھانیدار آئے گا اور ذات پُوچھے گا اور چونکہ راجپوت کے لفظ میں عزت و حُرمت پوشیدہ ہے لہذا یہ ذات لکھوائی جاتے جب تھانیدار ان کی اس بات پر بالکل ٹھنڈا پڑ گیا تو ابا کہنے لگے کہ جہاں تک میری طبیعت اور مزاج کا معاملہ ہے میں کسی بھی ذات، برادری، قبیلے کو دوسرے پر ترجیح نہیں دیتا میرے نزدیک ابن آدم سب سے اونچی ذات ہے اور بہترین انسان وہ ہے جو خدا ترس اور متقی ہے۔

اخبار العرب

میں ایک روز شرکت پرنٹنگ پریس میں تھا کہ زبیر صاحب کہنے لگے کہ اگر آپ "اخبار العرب" کے لئے کام کریں تو بہت ہی بہتر ہو۔ انگریزی، اردو اور عربی تین زبانوں میں شائع ہونے والے اس ماہنامے کو شائع کرنا قومی اور ملی خدمت ہے۔ اس کے توسط سے مشرقِ وسطیٰ اور دیگر ممالک میں پاکستان کا بہتر رنگ میں پروپیگنڈا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ وہیں بیٹھے بٹھائے میں نے حامی بھر لی اور اسی وقت امین الرحمٰن جو ان دنوں اپنے نام کے ساتھ "الاعرابی" بھی لکھتے تھے۔ مجھے اس سڑک پر لے آئے جس کا معروف نام ایمپرس روڈ ہے مگر جو ریلوے کے ٹنڈرز میں شارع عبدالحمید بن بادیس کے مختصر نام سے لکھی جاتی ہے۔ دفتر پہنچنے پر انہوں نے بتایا کہ پرچے کی کاپیاں جوڑنے والی ہیں۔ کتابت وغیرہ ہو چکی ہے چنانچہ میں نے پوری رات لگا کے کاپیاں جوڑیں اور صبح پرچہ پریس میں بھیج دیا۔

"اخبار العرب" میں کئی ماہ کام کرنے سے گو مجھے مالی طور پر تو نقصان ہوا مگر یہاں مجھے دو تین کام کی باتیں اور ایک آدھ کام کا آدمی ملا۔ کام کی باتیں تو یہ ماخوذ ہوئیں کہ شیریں زبانی اور عمدہ کنوینسنگ کے بل بوتے پر انسان وہ کام بھی بالکل فری کر سکتا ہے یا کرا سکتا ہے۔ جہاں کافی رقم خرچ ہوتی ہے۔ دوسرے یہ کہ جب دوسروں سے کام لینا ہو تو چہرے کو پر رونق بنانا اور آنکھوں میں محبت کے ڈورے ابھارنا اسی طرح مفید ہوتا ہے جیسے کام نکل آنے کے بعد "تو کون میں کون" پر عملدرآمد کرتے ہوئے آنکھوں کو ماتھے پر رکھ لینا۔

کام کے آدمی عصمت صاحب نکلے۔ اردو سے عربی میں رواں ترجمہ کرتے ہیں ان کا جواب ہی نہیں ہیں کہ عربی، فارسی وغیرھم سے شدبد رکھتا ہوں اور دوست احباب طنزاً کہا کرتے ہیں کہ عربی فارسی، انگریزی، اردو صحافت، ادب، اکاؤنٹس،

مینجمنٹ" المِ علم کے باوجود تم کہیں ٹکتے نہیں اس لئے تمہارا یہ حشر ہے۔ مگر میں نے دیکھا کہ عصمت صاحب بہترین اور مکمل عربی داں ہیں اور وہ "ٹکے" ہوئے بھی ہیں مگر ؎

کس نمی پرسد کہ بھیا کیستی

اُسی کو سا جے ...

ڈیرہ غازی خاں سے ہمارے دوست عبدالرشید قریشی لاہور آئے تو انہوں نے بتایا کہ ڈیرہ غازی خاں میں اور اس سے ملحقہ آزاد علاقوں میں بھیڑ بکریاں بہت سستی مل جاتی ہیں۔ عید قربان قریب ہے اگر ایک آدھ ٹرک وہاں سے بھیڑ بکریوں کا لے آیا جاتے تو سال بھر کی روٹی نکل آتی ہے۔ قریشی صاحب نے اس طرح ترغیب دی کہ میں پھڑک اٹھا اب سوال سرمائے کا تھا۔ کم از کم دس ہزار روپے کی رقم درکار تھی۔ ہم دونوں نے قرعہ فال حمید اصغر نجیبؔ کے نام نکالا۔ اس قرعے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہمیں پتہ چلا تھا کہ نجیبؔ صاحب نے لائل پور (فیصل آباد) میں اپنی کوئی جائیداد فروخت کی ہے اور یہ کہ نجیب واحد دوست ہے جسے روپے پیسے سے نہ تو پیار ہے اور نہ ہی وہ دوستوں کو مایوس کرتا ہے۔ چنانچہ بعد کے واقعات نے ثابت کیا کہ اس کے بارے میں ہماری رائے ایک سو دس فی صد درست تھی۔ نجیب نے ہماری تجویز سُنی اور کھٹ سے رقم ہمیں مہیا کر دی۔ چنانچہ میں ڈیرہ غازی خاں چلا گیا۔ وہاں سے تنیس چالیس میل کے فاصلے پر قریشی صاحب کے چند ملنے والے تھے چنانچہ ہم دونوں وہاں چلے گئے بھیڑوں اور بکریوں کی خرید کرنے کے لئے ہمیں دو تین روز وہاں قیام کرنا پڑا۔ جہاں میزبانوں نے ڈاچی کے دودھ سے ہماری خوب تواضع کی۔ قصہ مختصر یہ کہ میں بھیڑ بکریوں کا ٹرک بھر کر عازم لاہور ہوا میرے

ہمراہ آزاد علاقے سے دو آدمی بھی تھے۔ جنہوں نے وہاں بھی ہماری مدد کی اور طے یہ ہؤا کہ انہیں مناسب اجرت دے کر لاہور میں بھی ان سے کام لیا جاتے گا۔ دو تین روز بھیڑ بکریوں اور ڈاچیوں میں رہنے کی وجہ سے میرے سر میں درد شروع ہو چکا تھا۔ اس کے بعد متواتر چھبیس گھنٹے ٹرک میں بھی ان کی مخصوص بُو دماغ تک پہنچتی رہی۔ گو میں ٹرک کی اگلی نشست پر تھا۔ اس کے باوجود جب ہم لاہور کی بکر منڈی میں پہنچے تو مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا گویا بدبُو کے مارے ابھی میرا دماغ ماؤف ہو جاتے گا۔ بکر منڈی میں آڑھتیوں نے ہمیں گھیر لیا میں نے بہت کوشش کی کہ کوئی باڑہ کرائے پر مل جائے جیسا کہ تجویز کنندہ عبدالرشید قریشی نے جو اب ڈیرہ غازی خاں میں ہی رہ گئے تھے ابتداء میں بتایا تھا کہ باڑے بہ آسانی کرائے پر مل جاتے ہیں جہاں بھیڑ بکریوں کو رکھا جاتا ہے اور جب منڈی میں بھاؤ مناسب ہو انہیں فروخت کر دیا جاتا ہے مگر آڑھتیوں نے ایسا چکر چلایا کہ میں پریشان حال آزردہ خاطر ہو کر رہ گیا۔ ہم نے اس زمانے میں ایک اچھا بکرا ڈیرہ سے ایک سو روپے سے ڈیڑھ سو رُوپے میں خرید کیا تھا۔ مزدوری اور ٹرک کا کرایہ مستزاد تھا۔ مگر لاہور کے یہ بے رحم آڑھتی فی جانور ایک سو روپیہ سے زائد نہیں دے رہے تھے اور نہ ہی کسی دوسرے کو سودا چکانے کی اجازت دیتے تھے اس بک بک کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں اس حد تک چکرا گیا کہ میں نے وہ تمام جانور اصل قیمت خرید سے بھی کہیں کم پر آڑھتیوں کے متھے مارے اور ایک حمام میں جا کر متواتر تین گھنٹے تک نہانے کے باوجود یہی محسوس کرتا رہا جیسے میں رُوڑی میں دبا ہؤا ہوں اسی روز مجھے پتہ چلا کہ آڑھتیوں نے وہی جانور لاہور کے قصائیوں اور قربانی کے خواہشمند لوگوں کو ڈھائی سو سے تین سو رُوپے میں فروخت کئے اس تجربے سے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ گوشت کی مہنگائی اور نایابی کی اصل ذمہ داری ان آڑھتیوں اور دلالوں پر عائد ہوتی ہے جو بڑے بڑے تختوں (یا تخت پوشوں) پر مزے سے بیٹھے رہتے ہیں اور اپنی تجوریاں بھر لیتے ہیں۔ اگر قصاب براہ راست

اِن جانوروں کو خریدیں تو شہریوں کو بھی گوشت سستا اور عمدہ ملے نیز دور دراز علاقوں سے خون پسینہ ایک کر کے جانور لانے والوں کی بھی کھال محفوظ رہ سکتی ہے۔ بہر حال اس عید قربان کے موقع پر دس ہزار روپے کی یہ خطیر رقم بری طرح ضائع ہوئی یا یوں کہہ لیجئے کہ حمید اصغر نجید دوستوں کی خاطر قربان ہوگیا۔ اس شخص کا جگرا دیکھنے کی چیز ہے کہ اس نے آج تک یہ تک نہیں پُوچھا کہ بکروں دنبوں اور رقم کا کیا بنا ؟

اقرار خان

بی بی پاکدامن بیں خان جنرل سٹور کا مالک اقرار خان ہے۔ چہرے مہرے سے کھلنڈرا نوجوان نظر آتا ہے مگر ؎ بزرگی بعقل است نہ بسال" کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ بہت زیرک اور حاضر دماغ ہے۔ چھوٹی سی عمر میں ہی ؎ کام کروں گا بڑے بڑے" پر عمل کرنے لگا تھا۔ چنانچہ آج اس مقام تک جا پہنچا ہے کہ محلے کا ہر بڑا چھوٹا اقرار خان کی عزت کرتا ہے اور اپنے نجی معاملات میں اس کے مشوروں پر چلنے کی کوشش کرتا ہے۔

اقرار خان دوستوں کا مخلص اور ہمدرد دوست ہے۔ صاف گو اور اکھڑ ہے برداشت اور تحمّل میں بھی اپنی نظیر آپ ہے۔ مگر جب پانی کناروں تک آجاتا ہے تو پھر کشتی خدا پر چھوڑ دیتا ہے اور لنگر کو توڑ دیتا ہے ؟

انشاء اللہ خاں

بابو انشاء اللہ خاں ایک شخصیت یا فردِ واحد کا نام نہیں تھا بلکہ وہ ایک وسیع انجمن یا ادارے کا چلتا پھرتا جیتا جاگتا مجسمہ تھے۔ برصغیر کے نامور اخبار نویس سردار دیوان سنگھ مفتون جس مسلمان حساب دان سے بے حد متاثر ہوئے وُہ یہی انشاء اللہ خاں تھے۔ جن کی باتوں میں حنا کی خوشبو رچی ہوئی تھی۔ مخلص اتنے کہ دل میں گردش کرنے والا خون انہیں اپنا جزو اعظم قرار دینے پر مجبور ہو جاتا۔ ہمدرد ایسے کہ زخموں پر مرہم سے بڑھ کر اکسیر ثابت ہوتے۔ مشیر بنتے تو مشاورت کا حق ادا کر دیتے قانونی موشگافیوں کو سمجھنے اور اپنی بات دوسروں تک پہنچانے کے سلسلے میں قدرت نے انہیں ایک خاص ملکہ ودیعت کر رکھا تھا۔ حاجت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کے لئے دن میں کئی بار اپنی بلند و بالا بلڈنگ کے سادہ مگر پُروقار کمرے سے اٹھ کر سیڑھیاں عبور کر کے اوپر والی منزل کا سفر طے کرتے اور ماماں (اپنی اہلیہ محترمہ) سے پیسے مانگ کر لاتے اور اس سلسلے میں کبھی تہی دامنی اور مجبوری کا اپنی زبان سے اظہار نہ کرتے۔ بندہ بشر تھے روپے چھاپنے کی مشین تو انہوں نے لگا نہیں رکھی تھی۔ جب کبھی کسی کی امداد کرنے سے قاصر ہوتے ایک ایسی آہِ سرد بھرتے کہ حاجت مند جھرجھری لے کر ایک منٹ کی اجازت طلب کر کے غائب ہو جاتا۔ مذہب کو محض چند عقیدوں اور حوالوں کی حیثیت دینے کو قطعاً تیار نہ تھے۔ بلکہ اپنے عمل سے لوگوں کی معاشی بدحالی کو دُور کرنے اور

بے کاروں کے لئے کار تلاش کرنے میں لگے رہتے۔ انکم ٹیکس کے معاملات طے کرانے اور اداروں کے میمورنڈم آرٹیکل تیار کرنے میں انہیں بے حد مہارت حاصل تھی بڑے بڑے لکھ پتیوں اور کروڑ پتیوں کی ASSESSMENT کرانے کے بعد جب غریبوں، محتاجوں اور مسکینوں کی آمدنی پر نظر دوڑاتے تو اندر ہی اندر گھٹ کر رہ جاتے۔ نماز باجماعت ادا کرنے کی کوشش اور تلقین کرتے۔ اپنے بچوں کے ساتھ ساتھ غیروں کے لئے بھی گڑگڑا کر دعائیں مانگتے۔ اپنی اہلیہ (ماماں) کا تذکرہ ہمیشہ عزت و احترام سے کرتے اور کہتے کہ اگر بیویاں چاہیں تو خاوندوں کی عمریں لمبی ہو سکتی ہیں۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد "خیرکم خیرکم لاهله تم میں سے بہتر وہ ہے جو اپنے اہل والوں سے اچھا سلوک کرتا ہے) نیز " اَمَّا مَا یَنۡفَعُ النَّاسَ فَیَمۡکُثُ فِی الۡاَرۡضِ) جو ابنائے آدم کی بہتری کے لئے کوشاں ہوتا ہے اُسے دنیا میں نامور بنا دیا جاتا ہے) ہمیشہ ان کا منتہائے مقصود بنا رہا۔ خوشی و شادمانی کے مواقع پر کھنکھناتے ہوئے قہقہے لگا کر اللہ کے فضل کا اظہار کر لیتے لیکن غم و اندوہ کا اظہار اپنے چہرے سے نہ ہونے دیتے۔ موقع محل کے مطابق گفتگو کرتے۔ سفر کے دوران لطائف و ظرائف کی پٹاری بن جاتے۔ عبادت کے دوران اُن کا جسم اور رُوح دونوں میں گداز اور یکجہتی قابلِ دید ہوتا تھا۔ خُدا کے علاوہ کسی کو رب ماننے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ غرضیکہ ایک عام اِنسان میں جتنی خوبیاں اور اوصاف ہو سکتے ہیں۔ انشاء اللہ خاں میں وہ سب کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ افسوس ان کی موت سے دُنیا ایک اچھے انسان سے عین اس وقت خالی ہوئی جب خود غرضی، ریاکاری، نفسا نفسی اور دوسروں کے حقوق سلب کرنے کا عام رواج ہے اور جب انشاء اللہ خاں کی بے حد ضرورت ہے ۔

انعام

جن دنوں دارالحکومت کراچی تھا اور میری بڑی خالہ بھی وہیں رہتی تھی۔ ان دنوں میں پہلی بار کراچی جانے کے لئے لاہور سے روانہ ہوا میرے خالو نذیر احمد خاں وزارتِ خزانہ میں تھے خیال یہ تھا کہ ان کے توسط سے کہیں کوئی ملازمت مل جائے گی ریل کے جس کمپارٹمنٹ میں میری سیٹ ریزرو ہوئی میرے علاوہ ایک نوجوان فیشن ایبل لڑکی بھی بہت گھبرائی ہوئی بیٹھی تھی۔ ابھی گاڑی چھوٹنے میں کچھ وقت تھا کہ ایک محترمہ جو شکل و صورت سے اس لڑکی کی ماں لگتی تھی، ڈبے میں آئی اور اس نے بنظرِ عمیق سواریوں اور ڈبے کا جائزہ لیا بعد ازاں مجھ سے پوچھا کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ کیا کرتا ہوں۔ کہاں رہتا ہوں وغیرہ وغیرہ، میں جواباً اسے حقائق سے آگاہ کرتا رہا۔ آخر میں اس نے لڑکی کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اسے کراچی کینٹ اترنا ہے۔ پلیز ذرا اس کا راستے میں خیال رکھیں۔ میں ایک ماں کی پریشانی کو بھانپ گیا اور اسے بے فکر رہنے کی درخواست کرتے ہوئے اس کی بیٹی کی مکمل حفاظت کا ذمہ اُٹھا لیا۔ خانیوال، سمہ سٹہ، پڈعیدن غرضیکہ جہاں جہاں بھی اس نے چائے یا کسی چیز کی فرمائش کی۔ میں وہ چیزیں لا کر دیتا رہا۔ رات کو نہ سونے کی خواہش کے باوجود اس کی آنکھ لگ گئی اور وہ خوب سوئی جبکہ میں اسکے جوان خراٹے اور جسم کے زیر و بم کی آوازیں دیکھتا اور سُنتا رہا۔ کراچی چھاؤنی میں اس کے کئی عزیز اسے لینے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ وہ کمال بے اعتنائی سے اٹھی اور ان کے ہمراہ چلی گئی۔ میں کراچی سٹی جا اُترا جب کہ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ مجھے بھی کراچی چھاؤنی ہی اُترنا چاہیئے تھا۔ خیر جب میں نے اپنا کمبل اور چھوٹا سا اٹیچی کیس اٹھایا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری ہم سفر اپنا بیگ یہیں چھوڑ گئی تھی۔ میں بہت پریشان ہوا۔ خالہ کا گھر جہانگیر روڈ پر واقع کلفٹن کوارٹرز میں تھا بدقت تمام وہاں پہنچا تو گھر پر کوئی نہیں تھا وہ سب کسی شادی میں شرکت کے لئے کہیں گئے

ہوئے تھے ان کے پڑوسیوں کو اپنا تعارف کرایا تو وہ بھی دور دراز کے رشتے دار نکل آئے جس کا فائدہ یہ ہوا کہ سامان وہاں ٹکایا اور سوچنے لگا کہ بیگ کا کیا کیا جائے اسے کھولنے کے سوا چارہ نہ تھا۔ شاید اسی طرح مالکہ کا کوئی اتہ پتہ معلوم ہوجائے بالآخر یہی فیصلہ کیا کہ اسے کھول لیا جائے۔ بیگ میں زیورات کے علاوہ تین چار ہزار روپے نقدی بھی تھی۔ چند کاغذ تھے کچھ تصویریں اور چند حسینوں کے خطوط بھی تھے جو پتہ معلوم کرنے کے لئے پڑھنے پڑھے۔ ایک خط سے لاہور کا کچھ پتہ مل گیا۔ مگر کراچی کی خبر نہ ملی۔ مایوسی کی آخری حد کو چھو رہا تھا کہ ایک کارڈ نظر آیا جس پر سوسائٹی کراچی کی ایک کوٹھی کا نام درج تھا۔ نیز فون نمبر بھی دیا ہوا تھا۔ بیگ کو میں نے اسی طرح بند کیا دریں اثناء خالہ خالو اور بچے واپس آگئے۔ انہوں نے یہی سمجھا کہ بیگ میرا ہے نہ میں نے انہیں اس کے بارے میں بتایا نہ انہوں نے کچھ دریافت کیا۔ اگلے روز میں نے خالو کے دفتر سے اس فون نمبر پر رابطہ قائم کیا اور ان سے پوچھا کہ کیا کل کوئی مہمان ان کے ہاں لاہور سے آیا ہے۔ مخاطب کوئی خاتون تھیں پہلے تو وہ بہت چیں بہ جبیں ہوئی۔ بعدازاں جب بات کچھ اس کے پلے پڑی تو اس نے بتایا کہ اس کی بہن کل لاہور سے آئی ہے۔ میں نے کہا کہ اس کی ایک امانت میرے پاس ہے منگوالی جائے۔ کہنے لگی سائیکل رکشے پر بیٹھئے، فلاں جگہ اتریئے۔ سامنے ہی ہماری کوٹھی ہے

اس وقت گھر میں کوئی مرد نہیں جو بیگ آپ سے لے آئے میں حسب ہدایت سائیکل رکشہ پر بیٹھا اس کوٹھی کو تلاش کرنے میں فی الواقع کوئی دقت پیش نہ آئی۔ لان کے ایک جانب تین چار کاریں کھڑی تھیں اور چھ سات آدمی خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ میں نے السلام علیکم کے بعد اپنی آمد کی غرض بیان کی ابھی میں اپنا جملہ مکمل بھی نہ کرنے پایا تھا کہ ان میں سے ایک نے بیگ میرے ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ ایک دوسرے صاحب نے مجھے کرسی پر بیٹھنے کے لئے کہا۔ بمشکل پندرہ بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ ایک جیپ آئی جس میں ایک اے ایس آئی

اور دو سپاہی پھُدک کر باہر آئے اور مجھے پکڑ کر تھانے لے آئے دو گھنٹے تھانیدار صاحب مجھ سے پوچھتے رہے کہ میری جیب میں کتنے پیسے ہیں۔ اسے اتفاق کہیئے یا خوش قسمتی کہ میری جیب میں صرف دس کا ایک نوٹ بچا تھا باقی پیسے لاہور سے کراچی تک اور کراچی سے ان کی کوٹھی تک خرچ ہو چکے تھے تھانیدار نے بڑی تھانیداری دکھائی۔ میں نے کہا کہ میرا قصور کیا ہے میں تو ان کا فراموش کردہ بیگ پہنچانے آیا ہوں۔ کہنے لگا میں کچھ نہیں جانتا ابھی حوالات میں جاؤ گے تو دماغ ٹھکانے آجائے گا۔ اتنے میں فون کی گھنٹی بجی۔ خدا جانے فون پر کس سے تھانیدار کی بات ہوئی کہ اس نے مجھے کہا کہ جاؤ بھئی۔ بیگ میں تمام چیزیں صحیح سلامت نکل آئی ہیں۔ میں نے کہا کہ اچھا مجھے اب اجازت ہے۔ کہنے لگا ابھی ذرا ٹھہرو۔ تھوڑی دیر کے بعد وہی صاحب جنہوں نے بیگ میرے ہاتھ سے چھینا تھا۔ کار میں تشریف لے آئے۔ کہنے لگے۔ بھئی معذرت خواہ ہیں آپ سے۔ خواہ مخواہ شک کیا اور آپ کو تکلیف میں ڈالا یہ کہتے ہوئے انہوں نے اپنی نئی نکور بے شکن پتلون کی جیب سے دس دس کے نوٹوں کی نئی گڈی میں سے تین کڑکڑاتے نوٹ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا لو بھئی آپ کی ایمانداری کا انعام ہے۔ میں نے وہ نوٹ اپنے ہاتھ میں لے لیے بڑے اطمینان سے ان کی بتّی بنائی۔ کار کا دروازہ کھولا اور انہیں ڈرائیور کی سیٹ پر رکھ دیا۔ تھانیدار، سپاہی اور وہ خود "ارے ارے"! کرتے رہ گئے اور میں وہاں سے تیزی کے ساتھ باہر نکل آیا ؛

انوار قمر

مغلپورہ سے وُہ نوجوان جس کی ہفتے میں پانچ روز ڈاڑھی بڑھی ہوگی اور وہ ایک بڑے سے جہازی سائز کے لفافے میں اخباروں کے ادبی ایڈیشن اور درجنوں رسالے اٹھائے رکشہ کی تلاش کر رہا ہو۔ سمجھ لیجیے کہ وہ شیخ شفاعت کے اخبار "مغربی پاکستان" کا سینیئر سب ایڈیٹر انوار قمر ہے۔ اگر آپ کبھی اس اخبار کے دفتر میں جائیں۔ جس کمرے میں "کریڈ" آ رہی ہو اور اس کی مسلسل ٹک ٹک، ٹکوں ٹکوں کے زیرِ سایہ ایک پریشان حال نوجوان میز پر جھکا لکھنے میں یُوں مصروف ہو کہ اس کے ایک ہاتھ کی اُنگلیوں میں دبا ہُوا سگریٹ صرف ایک کش لینے کے بعد خوُد ہی بجھ جائے تو وہ ہمارے ممدوح کے سوا کوئی اور نہیں ہوگا آپ گھنٹوں اس کے سامنے بیٹھے رہیں وُہ اپنے کام میں اتنا محو ہوگا کہ اسے آپ کی آمد و رفت کا کچھ علم نہ ہوگا۔ البتہ اگر آپ کو دیکھ لے گا تو یُوں ملے گا گویا اسے آپ ہی کا انتظار تھا۔ مذکورہ بالا وُہ خوش قسمت لفافہ جو اس کے وجُود کا جزو لاینفک ہے وُہ دفتر سے آدھی رات کے بعد اس لئے گھر لے جاتا ہے کہ اس میں رکھی ہوئی اخباریں، کتابیں اور رسالے وہ گھر جا کر پڑھے گا اور گھر سے اس لئے دفتر لے آتا ہے کہ وہاں وقت نکال کر ان کی ورق گردانی کر لے گا۔ پوُرا ایک ماہ کے بعد وُہ چیزیں بالکُل کنواری شکل میں اٹھا کر رکھ دے گا۔ جب کہ لفافے میں ان کی جگہ اسی قِسم کے رسالے اور کتابیں لے چُکی ہوں گی ؛؛

آواز دے کہاں ہے

پاکستان بننے کے ایک ڈیڑھ سال بیں لاہور اسلامیہ ہائی سکول بھاٹی گیٹ بیں پڑھتا رہا۔ پڑھتا کیا تھا۔ گھر سے کتابیں اٹھا کر لے آتا۔ حاضری لگوانے کے بعد سکول کی دیوار پھلانگ کر داتا صاحب چلا جاتا۔ جہاں روزانہ قوالیوں کی محفلیں جمتی تھیں۔ قوالوں کی دو پارٹیاں مجھے بے حد محبوب تھیں ان بیں سے ایک

"سارے جگ توں نرالیاں وسدیاں دو میماں محمدؐ دے نام دیاں"

سنایا کرتی تھی اور دوسری قوالی کا ٹیپ کا بند ہوتا تھا۔

"پتہ لگ جائے کلی نوں اگ لگ جائے۔ کسے دی لگی کون جاندا"

ان قوالیوں کے دوران لوگ جب "حال" کھیلتے اور بے حال ہو کر بے سدھ ہو جاتے تو بیں خوابوں اور تصورات کی دنیا بیں کھو کر حسین وجمیل سرورکائنات کی تلاش بیں مصروف ہو جاتا جس کی دو میماں "سارے جگ توں نرالیاں وسدیاں نیں۔ قوالیوں سے اس عشق کی مجھے کئی بار سزا بھی بھگتنا پڑی، جب انگریزی پڑھانے والے ہمارے استاد جو "TWO MISERS" کی کہانی روزانہ زبانی رٹانے کے عادی تھے۔ کلاس بیں مجھے غیر حاضر پا کر اگلے روز اسمبلی بیں ہی میرے کان مروڑتے اور مجھے مرغا بنا کر ذبح کرنے کی دھمکیاں دے کر یہ ارشاد فرماتے کہ "آج اگر تم کلاس سے کھسک گئے تو کل تمہارا قیمہ کر دیا جائے گا"، مگر جونہی لڑکے اسمبلی سے کلاس روم کی جانب چلنے بیں اپنے

کسی نہ کسی نئے یا پُرانے کلاس فیلو کو ترغیب دے کر دیوار پھلانگ جاتا اور قوالوں کے طبلے اور ان کی آواز کے زیر و بم میں کھو کر دُنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتا۔ جب سالانہ امتحان میں اس روز کے کھسکنے اور متواتر غیر حاضر رہنے کے باوجُود میں نے بقول استاد محترم انگریزی میں بھی بہُت اچھے نمبر لئے تو انہوں نے مجھے دل کھول کر شاباش دی اور کہا " برخوردار میں نے کمرہ امتحان میں تمہیں اپنی آنکھوں کے سامنے رکھا تھا تاکہ تم نقل وغیرہ نہ کر سکو۔ بعد ازاں تمہارے پرچے بھی کٹھور بن کر دیکھے ہیں کہ ایک آدھ نمبر بھی تمہیں زیادہ نہیں دوں گا مگر تم توقعات سے کہیں بڑھ کر اچھے طالب علم ثابت ہوتے ہو۔ اگر تم کلاس میں بیٹھو تو مجھے یقین ہے کہ ہر امتحان میں اول آ سکتے ہو۔

بھاٹی گیٹ سکول میں ہم نے اپنی دھاک بٹھا دی تو اور پر پُرزے نکالے سکول کے بالکل سامنے ملک تھیٹر اور پیراماؤنٹ سینما تھا۔ فلم دیکھنا ہمارے خاندان میں گناہ عظیم سے کسی بھی طرح کم نہیں سمجھا جاتا تھا۔ لیکن میں گناہ و ثواب کے اس چکّر سے بے نیاز تھا۔ چنانچہ میں نے انہی دنوں اپنی زندگی کی سب سے پہلی فلم جو تھی تو انگریزی میں لیکن جس کا اردو ترجمہ مجھے یاد رہا" یعنی "ساحل سے دُور" دیکھی اس میں ایک جہاز کی تباہی کے بعد دو کم سن بچے ایک لڑکا، ایک لڑکی (جسے فلمی زبان میں ہیرو ہیروئن کہتے ہیں) ایک ویران جزیرے پر پناہ لیتے ہیں اور بعد ازاں جب وقت نے جہاز کے ڈوبنے کا واقعہ قصۂ پارینہ بنا دیا تو اچانک ایک روز لڑکا یہ محسوس کرتا ہے کہ لڑکی میں کرنٹ آ گیا ہے اور لڑکی اسی لڑکے سے اپنا جسم اور آنکھیں چرانے لگتی ہے جس کے سامنے وہ ننگ دھڑنگ پھرتی رہتی تھی۔ تب فضا میں یہ گیت اُبھرتا ہے کہ" ریشماں جوان ہو گئی ہے " فطرت اپنا کام کر جاتی ہے اور یوں اس ویران جزیرے پر اس نئے آدم و حوّا کی اولاد کی چہل پہل نظر آنے لگتی ہے۔

میں اس فلم کی کہانی سے بہت متاثر ہوا اور کئی روز تک اس خیال یا

واہمے کو جھٹکنے میں کامیاب نہ ہو سکا کہ اگر ان دو بے چاروں کو کوئی درندہ کھا جاتا تو کیا بنتا؟

میں ابھی لاہور میں ہی تھا کہ میرے نانا اور ماموں ضلع سیالکوٹ کے ایک گاؤں ربیو کے میں عارضی رین بسیرا بنا چکے تھے۔ ربیو کے میں بھینی میلواں ضلع گورداسپور سے نقل مکانی کرنے والے چودھری جان محمد، غلام محمد اور فتح محمد اور ان کے دیگر لواحقین (گوجر برادری) نے زمینیں الاٹ کروالی تھیں۔ چودھری عبدالحق حقانی نے اپنی برادری کو مشورہ دیا کہ حکیم صاحب کو بھی یہیں لایا جائے چنانچہ ان کے ہمراہ میرے تمام چھوٹے بہن بھائی بھی وہاں چلے گئے۔ میرا ابھی سالانہ امتحان نہیں ہوا تھا اس لئے گمٹی بازار لاہور کے مکان نمبر ۱۳۹۱ ڈی (یا شاید ۱۲۹۳ ڈی) میں اپنے چچاؤں اور بڑے دادا منشی عبدالستار کی تحویل میں رہا۔ گمٹی بازار کے اس چار منزلہ مکان کی سب سے نچلی منزل کسی عزیب کی کٹیا کی طرح بے حد تاریک رہتی تھی۔ اس میں گھنٹوں بیٹھ کر میں اپنی والدہ مرحومہ کی یاد میں خاموش اور خشک آنسو بہاتا اور اپنے تھانیدار چچا چودھری بشیر احمد سے بے حد خوف زدہ رہتا۔ بڑے چچا چودھری عبداللہ خاں کو مجھ سے بے حد پیار تھا اور وہ میرا بہت خیال رکھتے تھے۔ یہی حال باباجی عبدالقادر کا تھا۔ لیکن خدا جانے پولیس کی وردی سے میں بچپن سے ہی کیوں الرجک تھا۔ دراصل اس کی ایک نفسیاتی وجہ یہ تھی کہ میرے ابا ہمیشہ اپنے چھوٹے بھائی کو نصیحت کرتے رہتے تھے کہ تم پولیس میں افسر ہو۔ خدا کا خوف کیا کرو۔ یہ کیا کرو یہ نہ کیا کرو۔ چچا بشیر احمد میں ایک بہت بڑی خوبی میں نے یہ دیکھی کہ وہ بڑے بھائی کے سامنے ہمیشہ بھیگی بلی بن جاتے اور کبھی ایک لفظ بھی گستاخانہ ان کے منہ سے میں نے کبھی نہ سُنا حالانکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ انہوں نے کبھی ان نصائح پر عمل نہ کیا اس میں پولیس کے شعبے کا قصور ہے یا ان کا اپنا۔ بہرحال وہ ویسے کے ویسے ہی رہے تاہم زندگی کے آخری حصے میں ان

میں نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں اور وہ گناہوں کا کفارہ ادا کر کے اور توبہ کر کے اِس دُنیا سے رخصت ہوئے۔

میری والدہ تو تھیں نہیں۔ ابا دن بھر کہیں بچوں کو پڑھاتے۔ میں صبح گھر سے سکول جاتا اور قوالیاں سن کر واپس آتا۔ بستہ الماری میں رکھتا۔ اگر کچھ کھانے کو مِل جاتا تو کھا لیتا ورنہ اخبار فروشی سے بھی قبل آوارہ گردی کی جو عادت بلکہ لت پڑی ہوتی تھی۔ اس کو پورا کرنے کے لئے گھر سے غائب ہو جاتا۔ چڑیا گھر میں باغ جناح کی جانب جو جنگلہ لگا ہوا تھا۔ اس کے راستے جسم کو توڑ مروڑ کر داخل ہوتا۔ بندروں سے دل بہلاتا یا بادشاہی مسجد کے بلند و بالا میناروں پر چڑھنے کی آرزو دل میں لئے پہروں بیٹھا رہتا۔ مینار پر چڑھنے کا ٹکٹ ایک آنے کا ہوتا تھا۔ ایک روز میں ٹکٹ فروخت کرنے بابا کے پاس ہی بیٹھا ہوا گرسنہ نگاہوں سے مینار پر چڑھنے والوں کو دیکھ رہا تھا کہ بابا نے مجھے آواز دی کہ "کاکا ذرا ادھر آنا" میں جست لگا کر اس کے سامنے تھا کہنے لگا "مجھے ذرا حاجت ہے۔ پیٹ میں کچھ تکلیف ہے تو یہاں بیٹھ میں ابھی آیا اس نے تیرہ ٹکٹ میرے ہاتھ میں دے دیئے اور اپنی صندوقچی بند کر کے چلا گیا۔ میں نے صندوقچی کو ایک دو بار جھٹکے دیئے تو وہ کھل گئی۔ اس کے اندر لاتعداد آنے دونیاں پڑے ہوئے تھے۔ میں نے گیارہ آنے نکال لئے۔ تیرہ ٹکٹ میں سے آٹھ ٹکٹ فروخت کئے اتنے میں بابا آ گیا۔ میں نے کہا آٹھ ٹکٹیں فروخت ہوئی ہیں یہ لیجئے ان کے پیسے آٹھ آنے، بابا میری "ایمانداری" پر بہت خوش ہوا اور اس نے دو آنے مجھے بطور انعام دیئے۔ میں نے کہا "بابا یہ دو آنے تم رکھ لو۔ آج اور کل مینار پر چڑھنے کی اجازت دے دو۔ اس نے کہا" کاکا آج اور کل کیا روزانہ تمہیں مینار پر چڑھنے کی اجازت ہے۔ مگر یہ تو بتا روز اس پر چڑھ کر کیا کرے گا۔ آخر مینار ہی تو ہے۔ بار بار چڑھنے کا فائدہ؟ تھک جائے گا۔ میں نے کہا بابا میں چاہتا ہوں مینار اور بھی بلند ہو جائے اور آسمان تک چلا جائے تاکہ میں آسمان دیکھ آؤں۔ یہ سُن کر بابا ہنسنے لگا اور کہنے لگا "پُتر تیری مت تے ٹکانے اے"

- غرض کہ وہ تیرہ آنے لے کر میں تیر کی طرح شاہی مسجد سے باہر آیا۔ بھوک سے برا حال تھا۔ خوب پیٹ بھر کر روٹی کھائی صرف ایک آنہ خرچ ہوا۔ مونگ پھلیاں ریوڑیوں، خدا جانے کیا الا بلا دن بھر چباتا رہا۔ شام کو پھر بھی نو آنے بچ رہے رات بارہ دری میں گزاری، صبح اٹھا۔ اندرون بھاٹی میں ٹھاٹھ سے ناشتہ کیا اتنے میں ایک سپاہی نے آ پکڑا کہ چل چودھری صاحب بلاتے ہیں۔ کیا دیکھتا ہوں تھانیدار چاچا جی تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی دو چار چپت رسید کئے اور پولیس والوں کی فطرت کے عین مطابق میری تلاشی لی اور بقیہ سات آٹھ آنے برآمد کر کے اپنی جیب میں ڈال لئے اور مجھے سپاہی کی زیر نگرانی گھر بھجوا دیا۔ جہاں میری دادی اماں مرحومہ نے حسبِ معمول میری بلائیں لیں اور میرا صدقہ اتارا۔ اس گھر میں دادی اماں کے علاوہ اب ایک اور ہستی بھی مجھے اپنی ہمدرد اور غمگسار نظر آنے لگی تھی چنانچہ ہم دونوں چوری چھپے ایک دوسرے سے دل کی بات کہنے اور سننے لگے ان دنوں "دل لگی" فلموں میں ثریا کے گائے ہوئے گانے زبان زد و عام تھے۔ نیز "انمول گھڑی" میں نور جہاں کے گائے ہوئے گانے بھی بہت مشہور تھے۔

میری وہ ہمدرد ہستی مجھے " افسانہ لکھ رہی ہوں دلِ بے قرار کا " نہایت دل کش آواز میں اور میں اسے آواز دے کہاں ہے، دنیا مری جواں ہے،، دھیرے دھیرے سناتا۔ حالانکہ میری دُنیا اس کے کئی سال بعد جوان ہوئی۔ تاہم اپنی حرکات، زندہ دلی اور تندرستی کے سبب پیش از وقت مجھے جوان بننا پڑا۔ اِن دنوں خوش قسمتی سے جوانی کے تقاضوں میں فحاشی و رذالت شامل نہ تھی۔ لہٰذا ہم کسی بھی معصیت و مصیبت کے بغیر ہی انجانی منزلوں کی جانب رواں دواں رہے۔ دریں اثنا مجھے لاہور سے ڈنڈ پور کھرولیاں بلوایا گیا جو رینو کے سے صرف ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا اور جواب ہمارا نیا مسکن بنا تھا اور جس سے سالہا سال بعد تک میرا کسی نہ کسی رنگ سے رشتہ و پیوند رہا۔ اب جب کہ مجھے اس گاؤں کو چھوڑے ہوئے ایک

طویل مدت بیت گئی ہے اب بھی اس کے قبرستان سے چھوٹے بھائی حبیب کی محبت بھری باتوں، چچا عبداللہ خاں کی نوازشوں، باباجی عبدالقادر کے لطیفوں اور تایا عبدالغنی کے کارناموں کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔

ڈنڈپور کھرولیاں میں اس زندگی نے جنم لیا تھا جو موت کے منہ سے نکل آئی تھی۔ نئے ہمسائے، نئی گلیاں اور نئے مکان تعمیر ہوتے تھے جن میں نئے لوگ آباد ہوئے تھے۔ کچھ دیر جب تک زخموں میں ٹیسیں اٹھتی رہی۔ لوگ ایک دوسرے کے غموں میں شریک رہے مگر جہاں زمینوں، مکانوں اور جائیدادوں کی نیلامی اور کلیم کا نہ ختم ہونے والا چکر شروع ہوا۔ لوگ جو ایک دوسرے کے حبیب تھے۔ رقیب بن گئے۔ مقدمے بازی شروع ہو گئی اور ابلیس ایک بار پھر انہیں عجلہ دینے میں کامیاب ہونے لگا۔ تاہم گاؤں میں نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اس حریفانہ چپقلش سے بے نیاز ایک دوسرے کے لئے زندہ رہنے اور مرنے کے وعدے وعید کرتے رہے۔ پیٹ کی بھوک ختم ہو گئی مگر ہوس کا عفریت اچانک بیدار ہو گیا جس کے نتیجے میں بے شمار ناکتخدا لڑکیاں اپنے سرخ و سپید چہرے لئے کئی کئی ماہ کے لئے گاؤں سے غائب ہونے لگیں جن کے بارے میں بتایا جاتا کہ وہ اپنے عزیزوں سے ملنے گئی ہوئی ہیں مگر جب ڈیڑھ دو ماہ یا اس سے بھی زیادہ عرصہ گزارنے کے بعد وہ گاؤں میں واپس آئیں تو کوئی بھی انہیں پہچان نہ سکا۔ گال پچکے ہوئے اور آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئیں

گاؤں میں "عشق" کی اس بیماری کو روگ بنانے میں اس واحد "کھوئی" نے اہم کردار ادا کیا۔ جہاں پانی بھرنے کے لئے لڑکوں اور لڑکیوں کی مخلوط کلاسیں لگتی تھیں عشاء کی نماز کے بعد جب "کھوئی" میں زور زور سے دو بار بالٹی لگنے کی آواز آتی تو فوراً پتہ چل جاتا کہ الف، س کو بلا رہی ہے چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد س یہ تسلی کر کے کہ ہم سب لمبی تان کر سو رہے ہیں۔ بلی کی طرح اٹھتا اور قدم دبا کر چھت سے اتر کر اندھیرے میں غائب ہو جاتا۔ ایک اور لڑکی جو کافی

قبول صورت تھی - اور جس کی نیکی کا ڈنکا بجتا تھا - ایک کالے بھجنگے سورما کے سیاہ کارناموں کی پاداش بھگتنے کی بنا پر موت سے جنگ کر کے واپس آئی - اسی طرح ایک اور غریب گھرانے کی لڑکی کے بارے میں یہ پتہ چلا کہ وہ فلاں بااثر زمیندار کی تختہ مشق بنتی رہی ہے اس کے علاوہ کئی اور روح فرسا واقعات بھی ہوئے لیکن بہ حیثیت مجموعی گاؤں کی زندگی امن چین کی زندگی تھی - جہاں دن کے پچھلے پہر بڑ کے نیچے محفلیں جمتی تھیں - ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور یوسف زلیخا خوش الحانی سے گائی جاتی تھی - فارغ البالی کی آمد آمد تھی - لوگوں نے خودغرضی اور چشم پوشی کا ابھی سٹاک نہیں کیا تھا - گاؤں میں ابھی ٹریکٹر نہیں آئے تھے اور لوگ گوشت پوست کے بنے ہوئے انسان تھے - مگر اب یہ گاؤں بھی مشین بن گیا ہے - کھیتوں سے ایک سال میں کئی کئی فصلیں لی جاتی ہیں - مگر کاشت کاروں کے مسائل بڑھ گئے ہیں ان کی مشکلات میں اضافہ ہو گیا ہے - دائرے، تکیے اور محفلیں اجڑ گئی ہیں - سوہنی، ہیر اور زلیخا مر کھپ گئی ہیں - کھوئیاں ویران ہو کر ناپید ہو گئی ہیں - پرانی نسل ختم ہو رہی ہے - دوسری نسل بڑھاپے کی حدوں کو چھو رہی ہے اور تیسری نسل جوان ہو گئی ہے جسے گاؤں کی روایت، تاریخ اور ماضی کا کوئی علم نہیں ۞

ایسا بھی ہوتا ہے

چندروز ہوئے میں ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب جنہیں اپنے مضامین چھپوانے کا بے حد اشتیاق ہے۔ تشریف لائے اور آتے ہی میگزین ایڈیٹر سے کہنے لگے "لیجئے صاحب ایک ایسا مضمون تحریر کرکے لایا ہوں کہ آپ پھڑک اٹھیں گے"، یہ کہا اور چار پانچ سلپوں کا ایک مضمون سامنے رکھ دیا۔ ان کی بدبختی کہ "فرعون موسیٰ" پر وہ مضمون چند روز قبل میں نے انہی ایڈیٹر صاحب کی میز پر بیٹھ کر لکھا تھا اور اس کے ہمراہ فرعون کی زیر علاج ممی کی ایک تصویر بھی روزنامہ "جنگ" کراچی کے میر شکیل الرحمٰن کے نام چند دیگر مضامین کے ہمراہ روانہ کی تھی۔ میرا یہ مضمون جنگ کی ۲۷ نومبر کی اشاعت میں شائع ہوا تھا "فیشن کی دنیا" کے اس صفحے پر ترتیب و تزئین کرنے والے کا اسم گرامی غالباً ہمایوں عزیز چھپا تھا۔ لیکن مضمون پر میرا نام نہیں تھا۔ اخبارات میں بالخصوص "جنگ" میں ایسا سہو روٹین کی بات ہے۔ مضمون نگار کا نام نہ ہونے کی وجہ سے شہرت کے خواہاں ان صاحب نے مضمون کا عنوان تبدیل کرنے کی ناکام کوشش بھی کی لیکن وہ فرعون کی فرعونیت کا نعم البدل تلاش نہ کرسکا۔ میگزین ایڈیٹر نے چونکہ وہ مضمون پہلے دیکھا تھا لہٰذا اس نے یہ کہتے ہوئے سلپیں میرے سامنے ڈال دیں کہ "نعیم صاحب مضمون تو بہت تحقیقی ہے"، یہ تعریفی کلمات سن کر وہ صاحب بہت خوش ہوئے میں نے بھی حتی المقدور ان کی کاوش کو سراہا مگر جب وہ ڈینگیں مارنے سے باز نہ آیا تو ایڈیٹر صاحب کہنے لگے

"قبلہ اس مضمون کے ہمراہ فرعون کی ایک تصویر بھی تھی وہ کیوں نہیں لائے" یہ سننا تھا کہ وہ صاحب بے چارے ہکلانے لگے۔ ایڈیٹر کو مزید تاؤ آگیا کہنے لگے "بھئی ۲۷ نومبر کا جنگ لے آئیں۔ تصویر کا پازیٹو ہم خود بنوالیں گے" میں نے کہا "چھوڑو یار! کوئی بات نہیں۔ ایسا بھی ہوتا ہے۔

خیر یہ تو ایک مضمون یا کئی مضامین کا تذکرہ تھا۔ یار لوگ اخباروں میں ایسی ایسی خبریں بھی کسی دوسرے کے نام سے شائع کرا لیتے ہیں جس کی پاداش میں ان دوسروں کو بہت کچھ بھگتنا پڑتا ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں ہی ایک ضلعی صدر مقام میں ایک ایسے "نمائندہ خصوصی" کے قبضے میں دو اخبارات تھے جن کی پالیسی میں بُعد المشرقین ہے۔ ان میں سے ایک اخبار ایک اور صحافی کو مل گیا جب کہ اس کی نمائندگی کے حصول کے لئے ایک "شترمرغ" بھی کوشاں تھا جب اس "شترِ بے مہار" نے یہ دیکھا کہ اس کی تمام چالیں اور ٹسوے بیکار گئے تو اس نے ایک درست خبر میں جان بوجھ کر غلط نام بھر کر نئے مقرر ہونے والے "نمائندہ خصوصی" کی جانب سے اسے اخبار میں بھجوا دیا۔ نیوز ایڈیٹر نے یہ جان کر کہ ابھی ابھی نیا تقرر ہوا ہے۔ مہر وغیرہ نہیں بنی ہوگی اور یہ خبر فی الواقع ہمارے ہی نمائندے کی بھیجی ہوئی ہے۔ اس خبر کو چھاپ دیا "شترِ بے مہار" کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اس نے اس خبر کو خوب اُچھالا اور نئے نمائندے کے لئے گوناگوں پریشانیاں پیدا کر دیں ۔

المیّہ

آج سے پچیس تیس برس بیشتر جب صحافت و ادب میں مولانا عبدالمجید سالک، مولانا غلام رسول مہر، حمید نظامی اور مولانا ظفر علی خاں جیسے جید صحافی او ادیب موجود تھے جنہوں نے اپنے طرزِ عمل اور طرزِ زندگی سے صحافت کے معنی متعین کئے تھے۔ مجھے صحافت کی وہی تعریف بتائی گئی تھی جو آج بھی محض زبانی کی حد تک کہی جاتی ہے یعنی صحافت ایک مقدس فریضہ ہے جو [illegible] ملت کے لئے حتی الامکان رہنما اصول وضع کرتا ہے اور لگی لپٹی رکھے بغیر نہایت مناسب اور شستہ انداز میں ماضی کی خامیوں کی نشان دہی کرتے ہوئے مستقبل کی راہیں اجاگر کرتا ہے مگر تجربے اور مشاہدے کی بنا پر میں تمام مصلحتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوتے یہ کہنے پر مجبور ہوں کیونکہ ایسا کرنا بھی صحافیوں کے فرائض اور ذمہ داریوں کا حصہ بتایا جاتا ہے کہ ہماری صحافت دُنیا کے کسی بھی کاروبار اور تجارت سے قطعاً مختلف چیز نہیں ہے۔ اب اسے مقدس فریضہ قرار دینا یا سمجھنا جنت الحمقاء میں بسنے والوں کا ہی شیوہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر بڑے اخبار کی انتظامیہ کم سے کم مصارف سے زیادہ سے زیادہ منافع کمانے میں لگی ہوتی ہے اور اسی "حسنِ کارکردگی" کی بنیادوں پر اپنے کارکنوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے۔ ہر چھوٹا اخبار اپنے وجود کو قائم رکھنے کی فکر میں لگا ہوا ہے۔ اپنی زندگی بچانے کے لئے اسے جو پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں وہ اسے اس قابل نہیں چھوڑتے کہ وہ ملک و ملت کی رہنمائی کے لئے کچھ سوچ سکے۔ اس پر عملدرآمد تو بہت بعد کی بات ہے۔ علاقائی صحافت کی حالت مزید ابتر ہے۔ بڑے شہروں میں شائع ہونے والے چھوٹے اخبارات میں بھی یہ مرض کچھ نہ کچھ پایا جاتا ہے مگر علاقائی صحافت محض مالی منفعت کو مدِنظر رکھتی ہے اور اس سلسلے میں وہ کسی شریف آدمی کی پگڑی اچھالنے سے بھی

الم

گریز نہیں کرتی۔

"سقوطِ کوہستان" کے بعد ملک کے عظیم صحافی گر عنایت اللہ مرحوم نے پاکستانی صحافت میں جو دور رس انقلاب برپا کیا اس کے بے شمار مثبت نتائج کے ساتھ ساتھ لاتعداد منفی پہلو بھی ہیں جن سے قطعِ نظر نہیں کیا جا سکتا۔ انہوں نے بلاشبہ لیتھو پر چھپنے والے زیادہ سے زیادہ چار صفحات پر مشتمل اخبارات کی ظاہری وضع قطع کو بے حد خوشنما بنا دیا اور مالکان و انتظامیہ کو یہ سوچ عطا کی کہ ان کی بڑائی کا راز اخبار کی زیادہ سے زیادہ ضخامت میں پوشیدہ ہے۔ اس طرح میک اپ اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کے لحاظ سے ہمارے غریب اور کم وسیلہ ملک کے اخبارات دُنیا کے امیر ترین ممالک میں چھپنے والے اخبارات سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں رہتے۔ لیکن "قشر" کی جانب زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے "مغز" کھوکھلا ہونے لگا۔ اور اس کو بہتر بنانے کے لئے کوئی مفید لائحہ عمل تجویز نہ کیا جا سکا۔ اس ظاہری "ٹیپ ٹاپ" کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ہر اخبار "بیوٹی سنٹر" کھولنے پر مجبور رہا۔ جس کا کام صحافت کے داغ دھبوں کو دُور کرنا نہیں تھا بلکہ اس پر غازے کی دبیز چادر چڑھانا تھا۔ ان "بیوٹی سنٹروں" کی اہمیت روز بروز بڑھتی چلی گئی اور پرانے، محنتی اور اچھا لکھنے والے باصلاحیت افراد "کھڈے لائن" لگ گئے یا لگا دیئے گئے کہ اب عمدہ نگارشات سے کہیں زیادہ بیل بُوٹوں اور خوب صُورت چہروں کی ضرورت تھی۔

ماضی میں مالکان اور کارکنوں میں باہمی محبت و یگانگت کی فضا میں بھی واضح تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ صحافت میں جسے اب ٹریڈ کہنا زیادہ موزوں ہوگا "ٹریڈ یونین ازم" نے پر پُرزے نکالے اور کارکنوں کے حقوق دلانے کے نام پر عہدیداروں کے وارے نیارے ہونے لگے۔ صحافیوں نے صوبائی اور ملکی سطح پر اپنی "ٹریڈ یونینیں" بنائیں۔ مگر ساتھیوں کو شریکِ سفر کبھی نہ بنایا۔ پلاٹ، کوٹھیاں اور کاریں یونین کے نام پر حاصل کیں۔ مگر ان سے فیض یاب ہونے والے خوش نصیبوں کی تعداد بہت کم رہی۔ البتہ عہدیداروں نے ہر دور میں اور ہر ایک سے خوب مراعات حاصل کیں۔ اور اپنی خوش حالی میں اضافہ کیا۔

ادھر مالکان زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے ادھر کچھ کارکن

بھی بینک بیلنس بڑھا رہے تھے اس کے نتائج یہ برآمد ہوئے کہ قارئین اخبارات میں تحقیقی مضامین کے بجائے خوش نما اور دیدہ زیب کاغذ کے نقان پڑھنے کے لئے لے جانے لگے۔ اُدھر بقیہ اخباری کارکُن جن کے سہارے پر چل کر اور جن کا نام استعمال کر کے چند ساتھی عہدے دار امارت کی گدی پر بیٹھنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ احساس کمتری میں مُبتلا ہو کر رہ گئے۔ یوں ان کی کارکردگی کو اقتصادی اژدہا نگلنے میں کامیاب ہو گیا۔

ادب اور صحافت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ ادیب ہو یا شاعر اگر اخبارات اسے جائز حد تک تشہیر کے مواقع نہیں دیں گے تو وہ بے چارہ زندہ کہاں رہے گا۔ مگر ادب و صحافت کی خدمت کا جذبہ ناپید ہو چکا تھا۔ ادیبوں اور شاعروں نے اپنی نگارشات اور تخلیقات چھپوانے کے لیے اخبارات کے دفاتر میں چکر لگانے شروع کئے اور یوں ان کی روایتی انا کا جنازہ نکلا اور بڑی دھوم دھام سے نکلا مگر یہ تمام "چکر" اور "چولی چکی" بھی ان کو اِن کا جائز مقام دلانے میں اس لئے کامیاب نہ ہوئی کہ اَدبی صفحوں اور خصوصی اشاعتوں میں جن حضرات کا قبضہ تھا۔ ان کے اپنے بھی کچھ مقاصد تھے۔ تجارت GIVE & TAKE کے بغیر نہیں چلتی۔ اخبارات میں بھی اس پر عملدرآمد یوں ہو رہا تھا کہ ایک اخبار کا ایڈیشن انچارج یا کالم نگار اپنے کالم میں دوسرے اخبار کے کالم نگار کے بارے میں تعریف و تحسین کے پل باندھتا اگلے روز دوسرا کالم نگار اپنے کالم میں پہلے کا تذکرہ کرتا اور لکھتا کہ اس کے کالم کے کیا ہی کہنے! یوں "مَن تُرا حاجی بگوئم تو مُرا مُلا بگو" کے ایک نئے معنے وضع ہُوئے۔ جسے اخباروں کے کالم نگاروں نے اپنا "ماٹو" بنا لیا۔

کالم نگاروں کی نظریں کبھی اِدھر اُدھر جاتی بھی ہیں تو صرف انہی ادیبوں تک جو کسی کافی خانے یا قہوہ خانے میں وقت گزاری کے لئے جمے رہتے ہیں اور جن کی "زن نہ کن" نہ وہ ہے۔" اخبارات کے اَدبی صفحوں کا جائزہ لے لیا جائے تو معلوم ہو گا کہ پُورے ملک میں بس پانچ سات ادیب اور شاعر ہیں جو ہر کالم میں اور ہر صفحے میں گھسے ہُوتے ہیں۔ ماضی میں ادیبوں نے کبھی اپنے حقوق کی

حصول کے لئے کئی انجمنیں بنائیں جن میں رائٹرز گلڈ کو زمینی و آسمانی مراعات کا بحرِ بے کنار عطا ہوا مگر وہاں بھی ممبرشپ حاصل کرنے کے لئے اپنا آپ مارنا پڑتا تھا۔ سالہا سال قبل گلڈ کے زیرِ سایہ ایک ہاؤسنگ سکیم بنی تو راقم الحروف بھی اس کا ممبر بنا۔ دو صد روپیہ اس کے خزانۂ عامرہ میں جمع کروایا۔ طویل انتظار کے بعد جب فاقوں کی نوبت آئی تو میں نے درخواست دی کہ میری یہ رقم فی الحال مجھے واپس کر دی جائے لیکن میرا نام اس سکیم میں شامل رکھا جائے۔ مگر بعد ازاں جب گلڈ کو پلاٹ ملے اور اس نے اپنے ممبروں میں تقسیم کئے تو مجھے اپنی رقم واپس لینے کی پاداش میں پلاٹ سے محروم کر کے یہ ثابت کیا گیا کہ یہ ادبی انجمنیں بھی صحافت کی مانند تجارتی انجمنیں ہیں جہاں ادیبوں اور شاعروں کی مجبوریوں کے سودے ہوتے ہیں۔ بیش قیمت تحقیقی کتابیں لکھنے کی حوصلہ افزائی تو درکنار، قلم کاروں کو فاقے مارنے کے لئے مضبوط اور منضبط پروگراموں پر عمل درآمد یہ ظاہر کرتا کہ یہ سب کچھ کسی سوچی سمجھی سکیم کا نتیجہ ہے۔ ناشروں سے رائلٹی وغیرہ کے سلسلے میں ادیبوں کو پرانی شکایت ہے جسے رفع کرنے کے لئے کبھی کوئی کامیاب کوشش نہیں کی گئی۔ اخبارات بں تحقیقی مضامین لکھنے والوں کو سرے سے معاوضہ ہی نہیں دیا جاتا۔ جو چند اخبار "مٹی جھاڑنے" کے لئے کچھ دیتے بھی ہیں۔ تو اتنا خجل خوار کرنے کے بعد کہ اس کے لینے سے بھوکوں مرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کہ میرے جیسے قلمکار کا تو ذکر ہی کیا۔ مسلّمہ اور جیّد ادیبوں اور شاعروں سے بھی وہ اخبار جو آج بڑی بڑی بلڈنگوں اور جائیدادوں کے مالک ہیں۔ ایسا ہی سلوک کرتے رہے ہیں ان کے کشتگان میں مولانا عبدالمجید سالک بھی شامل ہیں۔ جنہوں نے اپنے نامور بیٹے ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کے نام ایک مکتوب میں اس زیادتی اور بے حسی کی واضح نشان دہی کی ہے اسی طرح ایک دوسرے معروف اور بزرگ صحافی اور ادیب مولانا چراغ حسن حسرت کی مثال بھی میرے سامنے ہے جن کا فرزند ارجمند ظہیر الحسن جاوید مجبور ہو کر آج کل راولپنڈی میں ٹیکسی چلا رہا ہے۔

بابر راٹھور

مختصر افسانہ نگاروں میں بابر راٹھور بھی شامل ہے جس نے "آدھی رات اور لڑکی" نے عجیب وغریب عنوان سے نہایت پاکیزہ اور خوب صورت کہانی کتابی شکل میں چھاپی تھی بابر اس محکمے میں ملازمت کرتا ہے۔ جہاں سینکڑوں کی تعداد میں شکایات و تجاویز عوام کی جانب سے موصول ہوتی تھیں۔ مدت ہوئی میں نے ایک روز جب اس سے کہا کہ بابر ہی کسی دکھیا اور غم زدہ کی بر وقت مدد کرنا ہمارا اخلاقی اور مذہبی فریضہ ہے اگر تم تعاون کرو اور کچھ ایسے افراد کے نام اور پتے اور ان کی شکایت کی تفصیل سے آگاہ کر سکو تو قومی پریس کے توسط سے ان کی جائز شکایات دور کرنے میں آسانی رہے گی تو بابر یک دم فرض شناس کلرک بن گیا اور کہنے لگا کہ جب تک افسران مجاز اس کی اجازت نہ دیں میں قطعاً ایسا کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ چنانچہ میں مزید کچھ کہنے کے بجائے اس کے اس جذبے کی تعریف کرنے لگا جس کی بنا پر وہ آج بھی طویل عرصے تک فرض شناسی سے کام کرنے کے باوجود اپنی سنیارٹی کے حق سے محروم چلا آ رہا ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے اس کی فائل اس کے کسی ایسے بزرگ کلرک کے قبضے میں آگئی ہے جسے دیانت دار کلرک اچھے نہیں لگتے۔

بابر کو پورے ایک ماہ کے بعد جو چند سو روپے تنخواہ ملتی ہے وہ اسے تیس برابر خانوں میں تقسیم کر کے رکھ دیتا ہے۔ جس ماہ اسے نیا جوتا کھانا پڑتا ہے یا ان کے پردے میں ننگ بدن کو ڈھانپنے کے لئے کپڑے سلوانے پڑتے ہیں وہ کئی خانوں سے رقم جمع کر کے تصرف میں لے آتا ہے اور یوں اس ماہ کے کئی خانے خالی ہو جاتے ہیں اور ان دنوں میں وہ محلے کی بھٹیارن سے روٹی، دال ادھار لیتا ہے جو پرانا گاہک ہونے کے ناطے اس کا بڑا لحاظ کرتی ہے یا پھر بابر کو ان دنوں دوستوں کی یاد بہت ستانے لگتی ہے جن سے وہ ان خالی دنوں میں کھانا بھی کھاتا ہے اور فلمیں بھی دیکھتا ہے۔ اس کی ایک سائیکل چوری ہو گئی تو وہ کتنے ماہ تک اس چور کو صلواتیں

سناتا رہا مگر ساتھ ہی یہ بھی کہتا تھا کہ پتہ نہیں اس بے چارے کو اس کی کتنی ضرورت تھی۔ آج کل اس کے نیچے ایک پرانی ۔ یعنی نئی سائیکل ہے جس کو وہ دو دو تالے لگا کر رکھتا ہے اور جب اسے کہیں لے جانا ہوتا ہے تو ان میں سے ایک تالہ ہمیشہ فراموش کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی کئی تاریں اور چین کو رکئی بار ٹوٹ پھوٹ چکا ہے "

بلوچ رجمنٹ

۳ر جون ۱۹۴۷ء کو جب مسلم اکثریت والے علاقوں اور ضلع گورداسپور کی شمولیت سمیت پاکستان کے منصوبے کا اعلان ہوا تو میں بھی نوجوانوں کے اس جلوس میں شامل تھا جو پاکستان زندہ باد، مسلم لیگ زندہ باد۔ قائد اعظم زندہ باد کے فلک شگاف نعرے لگاتا ہوا کے وسط میں واقعی بہت بڑے گول میدان جسے ریتی چھلہ کہا جاتا تھا۔ پہنچ گیا۔ ریتی چھلہ کے بالکل سامنے ڈاک خانہ تھا۔ اس سرکاری عمارت پر پاکستان کا جھنڈا لہرانے کی رسم کو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ جس کے دوران احباب خوشی کے مارے دیوانگی کے عالم میں نعرہ ہائے تکبیر بلند کرتے رہے۔ بعد ازاں پاکستان کی خوش حالی کے لئے دعا مانگی گئی اور حاضرین میں مٹھائی تقسیم کی گئی۔ مسلمانوں کے اس ولولے اور جوش کو علاقے کے ہندوؤں اور سکھوں کی کثیر تعداد بھی ہاتھ باندھ کر اور آنکھیں کھول کر دیکھ رہی تھی۔ سکھ تھانیدار ہزارہ سنگھ بھی پاکستان بننے پر لوگوں کو جھک جھک کر "دھنے واد" کہہ رہا تھا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں سے جب تک اپنی سلامتی اور حفاظت کا وعدہ نہیں لے لیا تھا۔ انہیں چین نہ آیا تھا۔ مگر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو جب برطانوی شاہی خاندان کے ایک رکن اور امیرالبحر لارڈ ارل ماؤنٹ بیٹن آخری وائسرائے ہند کی خواہشات کے مطابق (جس کی اہلیہ پنڈت نہرو سے بہت قربت رکھتی تھی)، برطانوی جج سرل ریڈ کلف کے غیر منصفانہ ایوارڈ کا اعلان کیا گیا اس سے کئی روز پہلے ہزارہ سنگھ نے اپنی

بندھی ہوئی ڈاڑھی کے بال اور بندھے ہوئے ہاتھ دونوں کھول دیئے اُس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور اس کی زبان بالکل بدل گئی اب وہ معزز مسلمانوں کو دیکھ کر انہیں پرنام کہنے کے بجائے رعونت، تکبر اور درشتی کا مظاہرہ کرنے لگا۔ لوگ اس کی سابقہ روش میں اچانک نمودار ہونے والی اس تبدیلی پر بھونچکارہ گئے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ اس کا سبب کیا ہے؟

ان کے اس سوال کا جواب ریڈکلف نے اپنے ایوارڈ کا اعلان کرتے ہوئے چند روز کے بعد یوں دیا کہ پاکستان کو ملنے والے بعض دیگر اہم علاقوں کے ساتھ گورداسپور کا پورا ضلع بھی بھارت کے حوالے کر دیا تاکہ اسے کشمیر پر اپنا تسلط جمانے میں کوئی مشکل پیش نہ آئے اس اعلان کے ساتھ ہی ہندوؤں کی درپردہ حمایت اور مالی اِمداد کا وعدہ لے کر سیاست و دانش سے نابلد سکھوں کے جتھے، نہتے مسلمانوں پر چڑھ دوڑے۔ پاکستان کا نام لینے والوں کی زبانیں گدی سے کھینچ لی گئیں۔ معصوم بچوں کو نیزوں میں پرو دیا گیا۔ ان گنت نوجوان اور کنواریاں لڑکیاں اغوا کر لی گئیں۔ لاتعداد عورتوں کو گوہر عصمت سے محروم کر دیا گیا اور پاکستان بنانے کے جُرم میں ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کو شہید کیا گیا اور انہیں اپنا آبائی وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ چنانچہ گورداسپور، امرت سر، جالندھر، فیروز پور اور دہلی تک بسنے والے مسلمانوں پر قیامت ہی نہیں قیامتیں برپا کی گئیں۔ اپنے عزیزوں، بیٹوں اور بیٹیوں، بہوؤں اور مال و دولت گھر بار کو لٹانے کے بعد جو سخت جان مسلمان اِن درندوں سے کسی طرح جان بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ انہوں نے پاکستان میں پناہ لینے کے لئے قافلوں کی شکل میں موت اور خون کا دریا عبور کیا۔ انہی دنوں قادیان کے گرد و نواح کے دیہات اور قصبات سے تباہ حال ہزارہا مسلمانوں کے درجنوں قافلے قادیان پہنچے۔ تعلیم الاسلام کالج اور ہائی سکول کا وسیع و عریض میدان ان سے پٹ گیا۔ ہر شخص کی یہ خواہش تھی کہ وہ اور اس کا کنبہ سب سے پہلے بحفاظت پاکستان پہنچ جائے۔ میری والدہ مرحومہ اِن دنوں بیمار تھیں

اور میرے ایک نئے بھائی کی آمد متوقع تھی۔ جس کی وجہ سے سبھی بیحد پریشان تھے۔ والدہ مرحومہ کی یہ خواہش تھی کہ گھر کے تمام افراد پاکستان پر قربان ہو جائیں۔ لیکن ان کا ایک بچہ (یعنی راقم الحروف) ضرور پاکستان پہنچ جاتے۔ چنانچہ میرے والد مجھے ہمراہ لئے "قیامت صغریٰ" کے اس میدان میں لے آئے۔ جہاں لوگ ٹرکوں میں سوار ہونے کے لئے جمع تھے اور جہاں تِل دھرنے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ اس روز روانہ ہونے والے ٹرکوں کی تعداد پانچ یا سات تھی جب کہ ان پر سوار ہونے کے خواہش مند کم و بیش بیس ہزار افراد تھے ایک ٹرک میں ابا کے کچھ واقف حضرات اپنے بیوی بچوں سمیت جگہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ میرے ابا نے ان میں سے ایک کی منت سماجت کرتے ہوئے درخواست کی کہ میرے اس بچے کو بھی ٹرک میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھے ٹرک پر چڑھا دیا ٹرک کے اندر کھڑے ہونے کی بھی ذرہ بھر گنجائش نہ تھی۔ قریب تھا کہ مجھے نیچے اچھال دیا جاتا کہ ایک مضبوط ہاتھ نے مجھے بازو سے تقریباً جکڑ کر اپنی جانب کھینچ لیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ فوجی وردی میں ملبوس ایک بارعب نوجوان مجھے ٹرک کے اوپر ان سلاخوں (لوہے کی بنی ہوئی وہ جالی جس پر ترپال وغیرہ ڈال کر ٹرک کو بند کر دیا جاتا ہے) پر بیٹھنے کا اشارہ کر رہا ہے۔ جہاں قریب ہی اس کا خود پہنا ہوا سر اور ہاتھوں میں پکڑی ہوئی سٹین گن تھی۔ ٹرک میں بیٹھے ہوئے اژدہام نے اس کو پاؤں رکھنے کے لئے تھوڑی سی جگہ دے رکھی تھی۔ اس کے باوجود راستہ بھر لوگ اس کی ٹانگوں سے اس بری طرح ٹکراتے رہے کہ پاکستان پہنچنے تک ان میں زخم آ گئے ان ٹرکوں کو بحفاظت پاکستان پہنچانے کے لئے ہر ٹرک پر ایک ایک فوجی سوار تھا یہ عظیم اور غیرت مند بہادر اس بلوچ رجمنٹ سے تعلق رکھتے تھے۔ جس نے سکھوں کے لاتعداد مسلح جتھوں اور ڈوگرہ فوج کی کثرت تعداد کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے بہادری کی وہ مثالیں قائم کی تھیں کہ "بلوچ رجمنٹ" کا نام ہی ان پر

لرزہ طاری کر دیتا تھا۔ شام کے قریب جب سورج اپنی کمین گاہ کی جانب تیزی سے رواں دواں تھا۔ ہمارا یہ قافلہ بٹالہ کی جانب روانہ ہوا۔ راستے میں ڈوگرہ فوج اور سکھوں نے قافلے کی تلاشی لی۔ اول تو کسی کے پاس کچھ تھا ہی نہیں مگر جو کچھ بھی تھا وہ اِن درندوں نے چھین لیا۔ مجھے والدہ نے فاضل کپڑوں کے طور پر ایک نیکر دی تھی تاکہ میں اپنے کپڑے باسانی دھو سکوں، تلاشی کے دوران عورتوں کے کانوں سے بالیاں اور کانٹے وغیرہ اتارنے والا ایک سکھ جب چار مسلح ڈوگرہ سپاہیوں سمیت ہمارے ٹرک پر آیا تو اس نے میرے ہاتھ سے وہ نیکر چھین لی اور وہ تمام زیور اس کے پائنچوں میں ٹھونستے ہوئے نیچے اتر گیا۔ میرے ساتھ کھڑا ہوا جیالا مسلمان سپاہی خون کے گھونٹ پی کر رہ گیا مگر اسے ان درندوں کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی۔ اس کی ایک وجہ جس کا انکشاف اس غیرت مند نے پاکستان کی سرحد پر پہنچ کر کیا وہ یہ تھی کہ ہر پاکستانی فوجی کے پاس سٹین گن تو تھی مگر اس میں چلانے کے لیے راؤنڈ نہ تھے۔ اور جو ایک آدھ راؤنڈ تھا بھی وہ بٹالہ میں قافلے پر کیے جانے والے حملے کی مدافعت میں ختم ہو گیا۔ تاہم بلوچ رجمنٹ کی دہشت کی وجہ سے قافلے میں شریک کسی شخص کا کوئی نقصان نہ ہوا رات بٹالہ میں قافلے کو روک دیا گیا۔ آدھی رات کے وقت اچانک سکھوں نے حملہ کر دیا۔ بلوچ رجمنٹ کے سپاہیوں نے سب کو ٹرکوں کے پیچھے یا کسی بھی پناہ گاہ میں لیٹنے کا حکم دیا اور آپ پوزیشنیں سنبھال کر بیٹھ گئے۔ جب سکھوں کا جتھہ قافلے سے چند گز دور رہ گیا تو انہوں نے اپنی سٹین گنوں سے گنتی کی وہ گولیاں اگل دیں جو ان کی تحویل میں تھیں۔ حملہ آور اس اچانک وار سے گھبرا گئے اور "بلوچ رجمنٹ آگئی" بلوچ رجمنٹ آگئی" کے آوازے بلند کرتے ہوئے لاتعداد لاشیں چھوڑ کر واپس بھاگ گئے۔ صبح جب ان لاشوں کو دیکھا گیا تو پتہ چلا کہ ان کی اپنی بزدلانہ دوڑ نے انہیں گولیوں سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ بٹالہ سے آگے ہمارا قافلہ جن راستوں سے گزرا۔ اِن کا مجھے علم نہیں لیکن اتنا مجھے یاد ہے اور آج بھی اس خونیں سفر کے ناقابلِ فراموش منظر سے میرے

جسم میں اک آگ سی لگ جاتی ہے کہ راستے میں کوئی موڑ، میدان اور جوہڑ ایسا نہیں تھا جہاں بے گناہ مسلمانوں کے بے گور و کفن لاشے، کٹے ہوئے سر، بازو چھاتیاں، رانیں اور سہاگنوں کے خون آلودہ دوپٹے نہ ہوں۔ یہ بے جان لاشیں زبانِ حال سے ہمیں پاکستان اور پاکستان میں رہنے والوں کے نام ایک اہم طویل پیغام دے رہی تھیں۔ اس پیغام کا جو حصہ مجھے یاد رہا وہ یہ ہے کہ

- پاکستان کا جھنڈا ہمیشہ بلند رکھنا اور
- ہماری قربانیوں کو رائیگاں نہ جانے دینا۔

واہگہ سرحد ابھی سات یا آٹھ میل کے فاصلے پر تھی۔ ہمارا قافلہ پھر رُک گیا غالباً اٹاری کے نزدیک سکھوں کے ایک گاؤں کی جانب سے ایک جتھہ کرپانیں اور تلواریں ہوا میں لہراتا ہوا باہر نکل آیا۔ بلوچ سپاہیوں کے لیڈر نے اپنے ساتھیوں کو جتھے کا نشانہ لینے کا حکم دیا اور خود ٹرک سے کود کر ان کے قریب جا پہنچا اور کہنے لگا "بے وقوفو۔ تمہارے دائیں بائیں بلوچ رجمنٹ ہے اور تم اس کے گھیرے میں ہو۔ جاؤ اپنے گھروں کی خبر لو" بلوچ رجمنٹ کا نام سُنتے ہی سکھوں نے بلا سوچے سمجھے واپس بھاگنا شروع کر دیا۔ اس افراتفری میں وہ چھوٹا سا گاؤں بھی جہاں یہ جتھہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ آناً فاناً خالی ہو گیا۔ عورتیں بین اور سیاپا کرتی ہوئی بچوں کو اٹھا کر مردوں کے پیچھے پیچھے بھاگ گئیں۔ بلوچ سپاہی کی اس حاضر دماغی سے قافلے کو آنچ تک نہ آئی اور ٹھیک ایک گھنٹے کے بعد ہم لوگ زندہ سلامت واہگے کی سرحد پر پاکستان کے قومی پرچم تلے جمع تھے۔ اکثر لوگ رو رہے تھے اور خوشی کے مارے ان کی زبانیں گنگ تھیں۔ سرحد پر لاہور اور اس کے گرد و نواح میں بسنے والے مسلمان بھائی پناہ گزینوں کے لئے روٹیاں پکا کر لاتے تھے۔ چنانچہ قافلے میں شریک ہر شخص روٹی حاصل کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا۔ کیونکہ گزشتہ ۳۲ گھنٹوں سے کسی کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی تھی۔ میں نے اپنے ساتھی یعنی بلوچ فوجی سے کہا کہ وہ مجھے ٹرک سے نیچے اترنے میں مدد دے چنانچہ اس نے مجھے ان سلاخوں سے جو میرے جسم کا حصہ بن چکی تھیں اور جن

کے نشان پاکستان میں آنے کے کئی سال بعد تک موجود رہے - نیچے اتار ا میں بھاگا ہوا گیا اور دنیا کی سب سے بڑی نعمت ـــــ ایک روٹی - حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا -

آدھی روٹی میں نے بلوچ سپاہی کی خدمت میں شکرانہ اور نذرانہ کے طور پر پیش کی تو اس کی پُرعزم اور پُرشکوہ آنکھوں میں بھی آنسو جھلملانے لگے بلوچ رجمنٹ کا یہ نامعلوم سپاہی خدا جانے آج کہاں ہے مگر میرے دل کی گہرائیوں اور تصور کی دُنیا میں اس کا چہرہ ہمیشہ موجود رہا ہے - یہ ایک لازوال حقیقت ہے کہ بلوچ رجمنٹ نے لاتعداد مسلمانوں کو مشرقی پنجاب سے پاکستان بحفاظت پہنچانے میں قابلِ تعریف کردار ادا کیا - افسوس صد افسوس - ہجرت کی داستانوں میں اس رجمنٹ کے کارنامے کہیں نظر نہیں آتے جس کا نام سُنتے ہی سکھوں کے جتھے ایک دوسرے کو کچلتے ہوتے تاریکی میں غائب ہو جاتے تھے ۔

بُوہے تے چُوہا

دریائے بیاس کے ایک کنارے پر ضلع امرتسر میں اگر ہمارا آبائی قصبہ بابا بکالہ واقع تھا تو اسی دریا کے ایک اور کنارے پر ضلع گورداسپور میں بھینی میلواں نامی وہ گاؤں آباد تھا جہاں میرے نانا حکیم محمد دین کی رہائش تھی - ہمارے نانا جیسا کہ میں نے کسی دوسری جگہ بھی تحریر کیا ہے - طبیہ کالج دہلی کے سند یافتہ تھے اگر کسی بڑے شہر میں پریکٹس کرتے تو لاکھوں میں کھیلتے - کار، بنگلے اور کوٹھیاں بناتے، سرمایہ داروں کی مانند سنگ دل اور کٹھور ہوتے۔ مگر انہیں زمینداروں کسانوں اور کاشت کاروں سے بے حد اُنس تھا وہ اکثر اس بات پر کڑھا کرتے تھے کہ دیہات میں لینے والوں کے لئے طبی سہولتوں کا فقدان ہے چنانچہ طبیہ

کالج سے طبابت کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے اپنی طبابت کے لئے بھینی میلواں کا انتخاب کیا جہاں چالیس پچاس میل کے فاصلے تک کہیں ڈاکٹر یا طبیب دستیاب نہیں تھا۔ یہ گاؤں اس لحاظ سے بے حد عجیب و غریب تھا کہ ہر سال اس کی ہیئت مکانیت اور اس کا حدود اربعہ تبدیل ہو جاتا تھا۔ دریا میں برسات کے دنوں میں جو طغیانی آتی تھی وہ پُرانے گاؤں کو اپنے ساتھ بہا لے جاتی تھی اور گاؤں والوں کو نئے سرے سے اپنے مکان بنانے پڑتے تھے۔ میں اپنی والدہ کے ہمراہ سال میں کئی بار نہیں تو کم از کم ایک بار دو ماہ کی چھٹیوں میں ضرور یہاں آیا کرتا تھا۔ اور یہی طغیانی کے دن ہوتے تھے اس گاؤں میں میں نے اپنی آنکھوں سے جو مشاہدہ کیا وہ یہ تھا کہ موت سامنے کھڑی ہو تب بھی انسان خود غرضی سے باز نہیں رہتا۔ سیلاب میں جو بے شمار چیزیں، دروازے کھڑکیاں، قیمتی لکڑی، سامان اور غلہ وغیرہ بہہ کر آتا تھا۔ کچھ پیشہ ور مشتاق تیراک اس کو نکال کر لے آتے تھے۔ جب کہ چند دنوں بعد آنے والا طوفان اس سامان کے ہمراہ ان کا اپنا سامان بھی بہا کر کسی دوسرے گاؤں تک پہنچا دیتا تھا۔ ہر سال یہ عمل دہرایا جاتا مگر دریا سے مظلوموں اور بے کسوں کا سامان نکالنے والوں کو کبھی اپنے اِس طرزِ عمل میں ترمیم کرنے کی توفیق نصیب نہ ہوئی تھی۔

بھینی میلواں میں مجھے جہاں اپنے مرحوم نانا نانی کی بے پناہ شفقت نصیب ہوئی وہاں مجھے زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ لوگوں میں بھائی چارہ خلوص اور ایک دوسرے کا خیال رکھنے کی خوبیاں متذکرہ بالا واقعات کے باوجود اس دور میں بڑی حد تک موجود تھیں۔ ماں کو بیبے، تاں لوبو اور پھوپھی کو بُوآ کہا جاتا تھا۔ عام بول چال میں "ہ" کا بے محابا استعمال کیا جاتا تھا۔ جیسے "گاہاں گاہاں چل" "ماہاں دی دال پکی" "بیبے دی سیاہی لیا ناری، سیاہی لیا کے بُوہے نے رکھی بُوہے تے چوُہا چڑھ گیا۔۔۔۔۔ وغیرہ وغیرہ۔ بڑوں کے دلوں میں چھوٹوں کے لئے پیار کا جذبہ موجزن رہتا تھا۔ چھوٹے بڑوں کا بے حد ادب و لحاظ رکھتے تھے۔ مگر جب یہاں کے رہنے والے باشندے پاکستان

آ گئے۔ بوبو کا لفظ اماں، امی اور "پپّا" پھوپھی جان میں بدلا۔ بوُہے پر چوبا چڑھنے کے بجائے گیٹ رواج پا گیا۔ مکان سیلاب سے محفوظ ہو گئے۔ دھن دولت اور زندگی کی آسائشیں وافر مقدار میں مہیا ہو گئیں تو وہ پیار شفقت، محبت خلوص سب دریائے بیاس کی نظر ہو گئیں یا ان کو کسی کی نظر لگ گئی۔ بہرحال ذکر ہو رہا تھا بھینی میلواں کا۔ ایک روز دریا کے کنارے "ٹاہلی" کا ایک بہت پُرانا درخت جڑ سے اُکھاڑنے کے لئے لوگ جمع تھے۔ کہ جڑوں سے ایک نہایت زہریلا سانپ نکلا اور پھن پھیلا کر حملہ آور ہو گیا۔ لوگ اس سے جان بچانے کے لئے اِدھر اُدھر دوڑے۔ سانپ نے ان کا پیچھا کیا۔ آگے گرم ریت تھی۔ اس پر وہ نڈھال سا ہو کر رہ گیا۔ اسی اثناء میں مَیں بھی اِدھر جا نکلا۔ میں وہاں کشتی، کبڈی، دوڑ، درختوں کے کڑوے پتے کھانے، گرم ریت پر گھنٹوں لیٹنے وغیرہم، اوٹ پٹانگ قسم کے مقابلوں میں حصہ لینے اور ان کے جیتنے کے سلسلے میں بدنام کی حد تک مشہور تھا۔ مجھے دیکھتے ہی ایک صاحب نے کہا کہ اس سانپ کو پکڑو تو ایک روپیہ انعام ملے گا۔ میں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ تار کے سگریٹ کی خالی ڈبیہ سانپ کی گردن کے ساتھ لگا کر اسے انگلیوں سے پکڑ کر اٹھا لیا اور سب کو نگنی کا ناچ نچایا۔ جس کے پیچھے میں جاتا وہ خوف کے مارے بھاگ جاتا کہ ابھی یہ ہاتھ سے نکل کر حملہ آور ہو جائے گا۔ کوئی نصف گھنٹے کے تماشے اور اِن سے سینکڑوں منتیں کروانے کے بعد میں نے اس دشمن انسان کو بیاس کی لہروں کے سپُرد کر دیا۔ جہاں اس نے پانی سے سر اٹھا کر غالباً میرا شکریہ ادا کیا کہ میں نے اسے گرم ریت سے ٹھنڈے پانی تک پہنچا دیا۔ ہمارے نانا کو علاج کے لئے دور دراز کے دیہات میں جانا ہوتا تھا۔ چنانچہ گائے بھینسوں کے ساتھ ساتھ ایک دو گھوڑیاں بھی وہ ضرور رکھتے تھے۔ "تنرٹا" میں ایک ہندو دماغی امراض کا شکار تھا شہروں میں بڑے بڑے ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دیا تھا۔ ہمارے نانا کے زیرِ علاج تھا۔ کئی بار میں بھی ان کے ہمراہ جایا کرتا تھا۔ اس ہندو کو جو عام ہندوؤں کے برعکس بے حد لمبا چوڑا اور جسیم تھا۔ لوہے کی مضبوط بیڑیوں میں باندھ کر رکھا جاتا تھا۔ ایک روز جب کہ وہ بالکل صحت مند نظر آ رہا تھا اچانک دورے میں مبتلا ہو گیا۔ ہمارے

نانا سے چیخ کر کہنے لگا "پیرو مرشد۔ اس لڑکے کو فوراً باہر بھجوا دیں۔ مجھے کچھ ہونے لگا ہے" چنانچہ نانا نے مجھے فوری طور پر تقریباً دھکا دیتے ہوئے باہر نکال دیا بعدازاں اس نے اپنے دورے کے دوران کمرے میں موجود خورد نوش کے برتنوں کی ایسی تیسی کر دی اور مضبوط کواڑ کو توڑ ڈالا یہاں تک کہ لوہے کی بیڑیوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا مگر یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اپنی اس تکلیف کے باوجود اس نے ہمارے نانا کو کچھ نہ کہا۔ گرمیوں کی ایک شاید دوپہر کو نانا گاؤں واپس آ رہے تھے کہ راستے میں ایک بہت بڑا سانپ جسے پنجابی میں "پھنیر" اور "کھڑپا" کہا جاتا ہے یعنی کوبرا گھوڑی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ گھوڑی کچھ بدکی مگر پچکارنے پر خاموش کھڑی ہو گئی۔ نانا ابا نے اسے دوسری طرف سے نکال لے جانا چاہا۔ مگر سانپ نے یہ راستہ بھی روک دیا بالآخر نانا نے بہ آواز بلند اسے مخاطب کر کے کہا کہ دیکھ میں اشرف المخلوقات ہوں اور تمہیں میرا خادم بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ میرا راستہ چھوڑ دو۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ سانپ نے اپنا سر زمین پر رکھا اور قریبی جھاڑیوں میں کہیں غائب ہو گیا۔ اسی طرح ایک روز کسی چھلاوے نے کئی بہروپ بدل کر انہیں ڈرانے اور خوف زدہ کرنے کی کوشش کی۔ مگر چونکہ وہ قرآن حکیم کے حافظ اور دینی علوم میں دسترس رکھتے تھے۔ اس لئے اسے بھی منہ کی کھانی پڑی۔

بھلیتی ملواں جانے کے لئے بالعموم میں اپنے اکلوتے ماموں حکیم عطاءالرحمن کے ہمراہ سائیکل پر نہر کی پٹڑی پر سفر کیا کرتا تھا۔ اس سفر میں مادھوپور سے بھی گزرنا ہوتا تھا۔ جو متحدہ پنجاب میں بہت بڑے ہیڈورکس کی بناء پر مشہور تھا اور جہاں سے بجلی کے علاوہ نہر اپر باری دوآب نکالی گئی۔ اس سفر کے کئی واقعات بھی ناقابلِ فراموش ہیں۔

ایک بار ہم پٹڑی پر جا رہے تھے کہ ایک سکھ دیسی بوتل کے نشے میں گھوڑی پر سوار ماجھے کی بولیاں، اچھلتا، کودتا، گاتا بدمست جا رہا تھا کہ اچانک اس کے "کیس" (سر کے بال)، ایک درخت کی شاخ میں پھنس گئے اور وہ اس سے لٹک گیا دریں اثنا گھوڑی اس کے نیچے سے نکل گئی۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح گاتا اور اچھلتا

رہا۔ مگر جب اس کے سر کو مسلسل جھٹکے لگے تو اس نے آنکھیں کھولیں اور اپنی حالت پر سخت متعجب ہو کر مدد کے لئے پکارنے لگا۔ ہمارے علاوہ قریب کے کھیتوں سے چند کسان آ گئے اور اس کو اُتارنے کا "سربندھ" کرنے لگے۔ ماموں نے یا شاید کسی اور نے اسے اتارنے کے بارے میں ہدایات دیں۔ اور اسے اس صلیب سے نیچے اتار لیا گیا۔ راستے میں ماموں نے بے اختیار ہنستے ہوئے کہا کہ اگر سکھوں سے اس کے اتارنے کے طریقے پُوچھے جاتے تو وہ یقیناً اس کا گلا کاٹ کر اتارنے کا مشورہ دیتے لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب سکھوں کے فی الواقع بارہ بجتے تھے۔ اب تو اس قوم نے پُوری دُنیا میں محنت و مشقت سے روزی کمانے کے ذرائع پر قبضہ کر کے اپنی روایات لباس اور شکلیں تک تبدیل کر لی ہیں۔

ایک دوسرا واقعہ غم اندوہ کا ہے۔ ایک امیر مسلمان خاندان اپنے تانگے میں سوار کہیں جا رہا تھا۔ میاں، بیوی، بچے، تانگہ بان اور گھوڑا سبھی قابل دید تھے۔ اچانک گھوڑا بدکا۔ تانگہ بان کی انتہائی کوشش کے باوجود یہ تانگہ مادھو پور ہیڈ ورکس کی تازوں میں پھنس کر اُلٹ گیا۔ تانگے میں سوار جو لوگ چند لمحے قبل خوشی سے قہقہے لگا رہے تھے۔ چنگھاڑتی ہوئی موجوں میں گم ہو گئے۔ گھوڑا اُلٹا لٹک رہا اور دو تین گھنٹوں کے بعد زخموں سے چُور ہو کر مر گیا۔

بھٹی

مالکان کو ناراض کرنے کے بعد انہیں منا کر ترقیاں حاصل کرنا بھٹی صاحب کے کمالاتِ فن میں سے ہے بھٹی دوستوں کو پرِکاہ کی حیثیت دیتا ہے جب کہ مخالفوں کو چائے پلا کر ان کا بیڑا غرق کر دیتا ہے۔ فون پر بڑے دبدبے اور رعب سے گفتگو کرتا ہے۔ واحد افسر ہے جس کی تقریباً ہر روز کسی نہ کسی معاملے میں پیشی ہُوا کرتی تھی۔ مگر جب بھی پیشی بُھگت کر آتا تھا۔ دوسروں کی تنزلی اور اپنی ترقی کا پروانہ ہمراہ لاتا تھا۔ بُہت زندہ دلی اور خوش مزاجی سے ملے گا تو سمجھ لیجئے آپ

کم ہے نہیں۔ قصہ مختصر گوناگوں خوبیوں کا مالک ہے۔ جس شخص کو تمام عمر کسی ایک ادارے میں ملازمت کرنا مقصود ہو وہ اگر بھٹی صاحب سے تربیت حاصل کر لے تو دُنیا کی کوئی طاقت اسے اس ادارے سے عمر بھر الگ نہیں کر سکے گی خواہ وہ طاقت ادارے کے مالکان ہی کی کیوں نہ ہو۔

بیدار سرمدی

بیدار، نوائے وقت میں نئے آنے والے صحافیوں کے اس گروپ سے تعلق رکھتا ہے۔ جو اب کافی پرانا ہو چکا ہے۔ اس کی شخصیت سے مرعوب ہو کر گزشتہ دنوں کسی قاری نے وقار انبالوی سے دریافت کیا تھا کہ بے زر میں بے نفی پر دلالت کرتا ہے مگر بے دار میں کیوں نہیں۔ وقار صاحب بزرگ صحافی ہیں اور بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں انہوں نے بے کے ساتھ ساتھ قاری کے اس خیال ہی کی نفی کر دی اور بتایا کہ بے زر میں بے کی الگ حیثیت ہے جب کہ بیدار میں بے الگ تھلگ نہیں کیا جا سکتا۔ میری دانست میں اصل جواب یہ ہے کہ بے اور دار الگ الگ کر لیں تو لطفِ معانی دوبالا ہو جاتا ہے۔ دار سولی کو کہتے ہیں اور ساتھ ہی یہ محاورہ بھی ہے "کہ نیند سولی پر بھی آجاتی ہے" تو بے دار کے معنی ہوتے وہ شخص جسے سولی پر بھی نیند نہ آئے۔ ان معانی کی صداقت دیکھنی ہو تو بیدار سرمدی کو جا دیکھئے جو اخبار کے دفتر میں بھی پوری طرح جاگ رہا ہوتا ہے۔

بیدار سرمدی شعر بھی اچھے کہتا ہے اور انٹرویو لینے کا ڈھنگ بھی اس کا خوب ہے۔ البتہ کسی کا انٹرویو چھاپنے کے ساتھ جو تصویر وہ لگاتا ہے اس میں کچھ گھپلا ہو جاتا ہے مثلاً شیر افضل جعفری والے انٹرویو میں اکثر لوگ شیر افضل جعفری کو بیدار سرمدی اور بیدار سرمدی کو شیر افضل جعفری سمجھنے لگے تھے۔

پروفیسر ڈاکٹر عبدالسلام

نوبل پرائز نے دُنیا بھر کے پریس کو مجبور کر دیا کہ وہ ڈاکٹر عبدالسلام کا شہ سرخیوں سے تذکرہ کرے اور ان پر ایک عظیم مذہب پرست سائنس دان کے حوالے سے مضامین اور کالم لکھے جائیں۔ ہمارے اخبارات، ریڈیو اور ٹی وی نے بھی ڈاکٹر صاحب کو ان دنوں خاصہ کوریج دیا ہے جب کہ انہیں نوبل پرائز آج ملا ہے مگر وہ بچپن ہی سے نوبل اور باکردار انسان ہیں۔ ان کے والد چودھری محمد حسین تہجد گزار اور خدا اور اس کے رسولؐ کے عاشق زار تھے، خود ڈاکٹر عبدالسلام نمازی، پرہیز گار اور خُدا ترس آدمی ہیں۔ جن کی طبیعت میں عجز و انکساری اور خمیر میں تواضع کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے ان کے ایک بھائی چودھری عبدالسمیع جن دنوں انجنیئر کی حیثیت سے ایک نہر پہ وارہے تھے اور کچھ دنوں کے لئے نہر پر واقع بنگلے میں فروکش تھے۔ مجھے اس علاقہ کی سیر و سیاحت کا جذبہ کھینچ کر وہاں لے گیا تو مجھے پتہ چلا کہ ایک باریش پنجگانہ نمازوں کا التزام کرنے والا افسر وہاں ٹھہرا ہوا ہے۔ جس سے کئی ٹھیکیدار وغیرہم بہت نالاں اور خوفزدہ ہیں جب میں نے اس "ہوّے" کو دیکھا تو وہ ڈاکٹر سلام کے چھوٹے بھائی عبدالسمیع تھے۔ جو مزاج اور طبیعت کے لحاظ سے اپنے والد گرامی اور بڑے بھائی کی کاربن کاپی تھے۔ بڑے تپاک سے ملے، بھاگ کر خود اندر گئے اور چائے بنوا کر لائے حالانکہ یہ کام وہ اِن نوکروں میں سے بھی کسی سے لے سکتے تھے۔ جو صاحب کے اشارے کے منتظر رہتے ہیں۔

ڈاکٹر عبدالسلام ان خوش قسمت افراد میں سے ہیں جنہیں شہرت، عزت اور دولت میسر ہے۔ مگر اس مقام تک پہنچنے کے لئے انہوں نے محنت اور استقلال کے ساتھ ساتھ آہ نیم شب کا نسخہ کیمیا بھی استعمال کیا ہے۔ ان کے دماغ میں غیر ترقی یافتہ اقوام بالخصوص پاکستانی قوم کی رفعت و ترقی کے منصوبے اس روز سے ہیں جب وہ عظیم سائنسدان بننے کی ابتدائی تیاریوں میں مصروف تھے وہ بنی نوع انسان کو اپنے بھائیوں اور ہم جنسوں کی غلامی سے نجات دلانے کا تہیہ کئے ہوئے

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں انہوں نے ہر اس تقریب میں جو ان کے اعزاز میں منعقد کی گئی۔ صاحبِ ثروت اصحاب کو قومی سطح پر سائنسی ترقی کے لئے اپنی خدمات پیش کرنے کا قیمتی مشورہ دیا اور اپنی تمام تر صلاحیتیں اس عظیم کام کے لئے وقف کرنے کا عہد بار بار دہرایا۔

مذہب سے بیگانہ اور خدا تعالیٰ سے دُور صرف مادی وسائل کا سہارا لینے والے اگر علمی و سائنسی لحاظ سے ترقی پا کر ایک مثال بن سکتے ہیں تو وہ مسلمان جن کی مذہبی اور معاشرتی ذمہ داری یہ ٹھہرائی گئی ہے کہ انہوں نے زمانے کی قیادت کرنی ہے اس میدان میں پیچھے رہ جانے کی صورت میں کیونکر امامت و قیادت کا فریضہ سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ تعلیمی پروگرام یکسر تبدیل کیا جائے اور جس قدر جلد ممکن ہو۔ ڈاکٹر عبد السلام کے قیمتی مشوروں پر عمل درآمد کیا جائے ؎

پروفیسر محمد سرور جامعی

سرور صاحب میرے ہی نہیں صحافت میں کئی عظیم ہستیوں کے بھی استاد ہیں۔ اور یہاں استاد کے وہ معنی نہیں جو "ہاتھ لا استاد کیوں کیسی کہی"، بلکہ میری مراد معلّم یعنی سکھانے والے سے ہے۔ میں جن دنوں ادارہ تحقیقات اسلامی کراچی میں کام کرتا تھا۔ فکر و نظر کی ادارت مشہور ادیب سید قدرت اللہ فاطمی کے سپرد تھی۔ جناب خالد مسعود نائب مدیر تھے اور میں ان کے معاونین میں شامل تھا۔ انہی دنوں سرور صاحب شاہ ولی اللہ اکیڈمی سے فارغ ہو کر ادارے میں آئے اور فکر و نظر کے مدیر اعلیٰ بنے۔ اس پر ابھی چند ہی روز گزرے ہوں گے کہ انہوں نے میرے کام کو دیکھتے ہوئے ادارے کے سربراہ کے نام پر زور سفارشی چٹھی لکھی کہ مجھے اسسٹنٹ ایڈیٹر کا گریڈ ملنا چاہیئے، انہی دنوں ایک نئے ہفت روزہ کا منصوبہ بھی تیار ہو رہا تھا۔ جس کا بعد ازاں "صدائے ملت" کے نام سے ایک آدھ شمارہ شائع بھی ہوا سرور صاحب نے اس خوب صورت، دیدہ زیب اور بلند پایہ ہفت روزہ کے لئے بھی میرا نام بطور مدیر معاون کے تجویز فرما کر اپنی سفارش اُوپر بھجوائی ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ مجھے لاہور کی یاد ستانے لگی اور میں نے کراچی کو خیر باد کہہ دیا۔

فکر و نظر یا صدائے ملت کا دفتر ادارے کے مرکزی دفتر سے کچھ فاصلے پر تھا۔ سرور صاحب ٹین کے ایک جیبی ڈبے میں اپنا دوپہر کا کھانا لایا کرتے تھے جو دو توس اور ایک انڈے کے آملیٹ پر مشتمل ہوتا تھا۔ مجھے انہوں نے دیکھا تو پہلے ہی روز اپنے اس "وافر" کھانے سے ایک

توس اور آدھا آملیٹ زبردستی مجھے کھلا دیا۔ اس کے بعد جب تک میں رہا اِن کا ٹین کا وہ ڈبہ مجھے دعائیں دیتا رہا کہ جہاں پہلے اس کے پیٹ میں دو توس اور ایک انڈے کا آملیٹ آیا کرتا تھا اب پانچ چھ توس اور تین تین انڈوں کے آملیٹ ٹھونسے جانے لگے۔ سرور صاحب کی خوراک وہی رہی بقیہ من و سلویٰ اڑانا میرے دفتری فرائض میں شامل کر دیا گیا۔

سینکڑوں نادر مضامین اور درجنوں قیمتی کتابوں کے یہ عظیم مصنف جو صحافتی علمی اور ادبی لحاظ سے محتاج تعارف نہیں اور ماضی میں شاندار اخبار آفاق کے ایڈیٹر رہے ہیں اور جن کے کارنامے شاہ ولی اللہ اکیڈمی تک پھیلے ہوئے ہیں چند روز قبل مسجد شہداء کے سامنے "فٹ پاتھ" پر یوں ملے کہ ان کی روشن پیشانی پر فکر کی لکیریں واضح تھیں، حسبِ معمول بہت شفقت سے ملے۔ میں نے پریشانی کا سبب پوچھا تو فرمانے لگے۔ مکان کا کرایہ دینا ہے کوئی انتظام نہیں ہوا" اس بزرگ صحافی، ادیب اور مصنف سے یہ سننا تھا کہ میری ٹانگیں کانپنے لگیں اس سے ایک روز پیشتر ہی میں ایک زندہ قوم کے ایک مصنف کی داستان پڑھ رہا تھا۔ جس میں تحریر تھا کہ جب وہ مرا تو بنک میں اس کے لاکھوں ڈالر جمع تھے۔

پنڈت غلام رسُول

رائل پارک ، بیڈن روڈ ، نسبت روڈ ، میکلوڈ روڈ ، اِن چار سڑکوں پر مُولی کی طرح بالکل سیدھا جو شخص پینٹ کوٹ میں اپنے دُبلے جسم اور سُوکھی ہوئی ٹانگوں کو چھپانے کی کوشش میں مصروف کٹے ہوئے پتنگ کی طرح ہلکورے کھاتا چلا جارہا ہو وہ پنڈت غلام رسُول کے علاوہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ جب آپ اس کی گفتگو سنیں گے تو سب کام کاج چھوڑ چھاڑ کر اس کے لبوں سے نکلنے والے مرصّع جمُلوں کی شیرینی اور ہیئتِ ترکیبی پر غور کرنے لگیں گے۔

پنڈت غلام رسُول برصغیر کا کہنہ مشق آرٹسٹ ہے جس نے بمبئی سے اپنے فن کا آغاز کیا تھا اور بعد ازاں درجنوں فلموں میں کام کر کے اپنا لوہا منوایا۔ پاکستان میں بھی اس نے "باکس آفس" فلموں میں نمایاں کردار ادا کئے مگر جب فلم انڈسٹری نے نعیم ہاشمی، ایم اسماعیل، آزاد، علاؤالدین اور بیسیوں دُوسرے نامور فنکاروں کو "بھولے بسرے" بنا دیا وہاں پنڈت غلام رسول کا جسم و روح سمیت سڑکوں پر نظر آجانا غنیمت ہی تو ہے۔

ثاقب زیروی

زیرہ ضلع فیروزپور کے رہنے والے محمد صدیق ثاقب زیروی کا نعت گوئی میں ایک خاص مقام ہے اس کے ساتھ ہی قدرت نے اُسے آواز کا حسن بھی وافر عطا کیا ہے۔ برصغیر کی بہترین مسحور کن آوازوں میں ثاقب کی پرکشش تانیں بھی شامل ہیں۔ وہ جب کوئی غزل، نظم یا نعت پڑھتا ہے تو حاضرین بے اختیار سبحان اللہ کہہ اٹھتے ہیں۔ پانچ دس سال پیشتر جب نوٹے سیڑھیاں چڑھنے کے بعد اُن کے دفتر میں حاضری دیا کرتے تھے تو وہ بڑے تپاک سے ملا کرتے تھے بے تکلفی میں ایک آدھ بار ان کی جیب سے میں نے کچھ رقم بھی نکال لی تھی۔ مگر بعد ازاں جوں جوں ان کے حالات اچھے ہوتے گئے اور وہ خالص کاروباری بننے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے تو ان کا بلند و بالا دفتر اپنی پہنچ سے باہر ہو گیا تاہم یہ اطلاع ملتے ہی کہ ثاقب زیروی آج فلاں جگہ اپنی نعت سنائیں گے اُن کی آواز کے جادو سے لطف اندوز ہونے کے لئے دل مچل ہی جاتا ہے۔ ثاقب کی آواز میں بلاشبہ شعلے کی لپک، شبنم کی ٹھنڈک اور گلاب کے پھولوں کی مہک آتی ہے۔ جو کانوں کے راستے رس گھولتی ہوئی دل کے اندر داخل ہو کر خون کا حصہ بن جاتی ہے ؛

ٹرانسپورٹ ڈائجسٹ

ہمارے ملک کے اندر انگریزی میں شائع ہونے والا معیاری ماہنامہ "ریڈرز ڈائجسٹ" جس کے کئی ایڈیشن مارکیٹ میں آتے ہیں۔ بے حد مقبول تھا اور آج بھی ہے میرے دماغ میں یہ منصوبہ آیا کہ کیوں نہ اُردو میں کوئی ایسا ہی ڈائجسٹ شروع کیا جائے جس میں اخلاقی، تاریخی اور رومانی کہانیاں، افسانے اور نظمیں وغیرہ ہوں، انہی دنوں مجھے سعید ہاشمی مل گیا جو طباعت و اشاعت اور کنویسنگ کا عظیم ماہر تھا۔ ہم دونوں نے نسبت روڈ پر دفتر قائم کر کے "ٹرانسپورٹ ڈائجسٹ" کی تیاریاں شروع کر دیں۔ سرمائے کا انتظام میں نے کچھ قیمتی جائیداد فروخت کر کے کیا جب کہ اشتہارات کی حصولیابی وغیرہ کے فرائض سعید ہاشمی نے اپنے کھاتے میں ڈال لئے۔ ان دنوں گو ملک میں ٹرانسپورٹ کا سلسلہ خاصہ وسیع تھا مگر ان کا کوئی مطبوعہ ٹائم ٹیبل نہ تھا۔ ہم نے ریجنل ٹرانسپورٹ اتھارٹی کی وساطت سے ٹرانسپورٹروں کو قائل کیا کہ ان کا بھی ریلوے ٹائم ٹیبل کی طرح ایک باقاعدہ ٹائم ٹیبل ہونا چاہیئے جب کئی ماہ کی تگ و دو کے بعد ہم انہیں اپنی بات منوانے پر قادر ہو گئے تو ہم نے انہیں یہ پیشکش کر دی کہ ان کا یہ ٹائم ٹیبل ہم خود چھاپ کر دیں گے۔ وہ ہمیں صرف ایک صفحے کا اشتہار دے دیں۔ چنانچہ ہماری یہ تجویز بھی منظور کر لی گئی۔ اب معاملہ خاصہ دشوار ہو گیا چاروں صوبوں کے اہم شہروں اور ضلعی صدر مقامات سے چلنے والی بسوں کا ٹائم ٹیبل ترتیب دینا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں تھا۔ چنانچہ اس غرض سے سعید ہاشمی اور میں نے ملک کے چپے چپے کا طویل و عریض دورہ کیا یہاں تک کہ بلوچستان میں دالبندین، گوادر، پسنی۔ نوشکی اور خدا جانے کہاں کہاں تک پہاڑوں، جنگلوں اور ندی نالوں میں مارے مارے پھرے، بہر حال تقریباً چھ سات ماہ کی محنت شاقہ کے بعد "ٹرانسپورٹ ڈائجسٹ"، منظر عام پر

آگیا اور یوں بفضلہٖ تعالےٰ ہمارا منصوبہ بے حد کامیاب رہا۔ اس ڈائجسٹ میں جہاں دور دراز چلنے والی بسوں اور رُوٹوں کا مکمل حال اور کیفیت درج تھی۔ وہاں ساتھ ہی ساتھ ہلکے پھُلکے مضامین، افسانے اور نظمیں بھی تھیں۔ جنہیں قارئین اور ٹرانسپورٹروں نے تحسین کی نظروں سے دیکھا۔ جب ہمارا کام خوب چل نکلا تو نہ جانے سعید ہاشمی کو کیا ہُوا کہ اس نے حساب کتاب بتانے کے سلسلے میں کچھ رازدارانہ رویّہ اختیار کر لیا۔ اُدھر میں ابتدائی سرمائے کے علاوہ کافی مزید رقوم بھی خرچ کر چکا تھا۔ مگر اشتہارات کے بلوں کی وصُولی جو نوّے فی صد سے زائد ہو چکی تھی اور ہمارے اخراجات سے تقریباً سات آٹھ ہزار روپے سے زائد تھی اس کا کوئی پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ایک روز مجھے پتہ چلا کہ ہاشمی صاحب نے مشینری بنانے والے کسی بہت بڑے ادارے کے کیٹلاگ چھاپنے کا ٹھیکہ لے رکھا ہے اور ٹرانسپورٹ ڈائجسٹ کی تمام رقوم ادھر کھپا دی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا تو کہنے لگے کہ کیٹلاگ کے کام میں ہزاروں روپے کی بچت متوقع ہے۔ میں نے سوچا تھا کہ اچانک اس منصوبے سے آپ کو آگاہ کروں گا۔ مجھے سخت افسوس ہُوا بعدازاں انھوں نے بہت کوشش کی کہ میرے دل کی گرہ کو کھول سکیں۔ لیکن ایک روز میں اچانک اٹھا انہیں الوداعی سلام کیا اور ۷، اے نسبت روڈ کے دفتر سے باہر چلا آیا۔ ہمارے اس ڈائجسٹ کے کافی عرصہ بعد "اردو ڈائجسٹ" نے اپنی اشاعت کا آغاز کیا اور آج تو یہ حالت ہے کہ ڈائجسٹوں کی بھرمار ہو گئی ہے۔ گو ان میں اخلاقی پہلوؤں کی جانب توجہ دینے والے ڈائجسٹ اور ماہوار رسالے بہت کم ہیں جیسے "حکایت"۔ تاہم سماجی، معاشی اور اقتصادی گھٹن کے اس جاں گسل دور میں یہ ڈائجسٹ جس قسم کی تفریح بھی مہیا کر رہے ہیں اسے غنیمت ہی سمجھنا چاہیئے ؞

ٹھیکیدار رشید احمد

کچہری روڈ گجرات پر آرٹ کا ایک عمدہ نمونہ ٹھیکیدار رشید احمد کی وہ کوٹھی ہے جس کی بیٹھک میں علم دوست حضرات کی آمدورفت جاری رہتی ہے یہاں شریف کنجاہی صاحب بھی مل جائیں گے۔ قربان طاہر بھی اور لاہور کے چند اخباروں میں کام کرنے والے اصحاب بھی۔

ٹھیکیدار رشید احمد نام اور کام کے ٹھیکیدار ہیں مگر علمی و ادبی جلسوں میں وہ ایسے مقرر ثابت ہوتے ہیں۔ جن کے دامن میں علم و ادب کے لامحدود ذخائر ہیں۔ موضوع کے اعتبار سے تقریر کرتے ہیں۔ جو معلومات سے پُر اور تصنع سے مبرا ہوتی ہے۔ لکھنے لکھانے سے بھی انہیں شغف ہے۔ ابھی گزشتہ دنوں ہی ایک اشتہار میری نظر سے گزرا ہے۔ جس سے معلوم ہوا ہے کہ عنقریب ان کے قلم سے کوئی تصنیف ابھرنے والی ہے جس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ یقیناً از حد قیمتی ہوگی کہ اس کے مصنف ٹھیکیدار رشید احمد ہیں۔

جامکے چیمہ

مڈل کا امتحان سر پر تھا۔ میرے ابا ان دنوں ڈی بی ہائی سکول جامکے چیمہ میں پڑھاتے تھے۔ جب کہ میں وہاں زیر تعلیم تھا۔ ہمارے حساب کے ماسٹر چودھری رحمت علی صاحب جن کی شکل و صورت علامہ اقبال سے کافی حد تک مشابہ تھی۔ مجھ پر بے حد مہربان تھے۔ میری ضد یہ تھی۔ کہ میں ورنیکلر فائنل کا امتحان دوں گا۔ جب کہ انگریزی کے استاد ماسٹر محمد شریف صاحب کی رائے اس کے برعکس تھی میں نے چودھری رحمت علی صاحب سے اس سلسلے میں مدد چاہی۔ انہوں نے ابا کو راضی

کر لیا لیکن شرط یہ عائد کر دی گئی کہ میں سکول کا سالانہ امتحان بھی ضرور دوں گا تاکہ ورنیکلر فائنل میں فیل ہونے کی صورت میں نویں جماعت میں پہنچ سکوں۔ داخلہ بھیجنے کا وہ آخری دن تھا چنانچہ داخلہ بھجوا دیا گیا۔ قدرت خدا کی۔ نتیجہ آیا تو میں پاس تھا جبکہ ماسٹر محمد شریف صاحب کا ہونہار صاحبزادہ جس سے سب نے توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ ناکام ہو گیا۔ ورنیکلر کا امتحان دینے کے لئے جا سکے سے ہمیں روزانہ ڈسکہ جانا پڑتا تھا جو ہمارا سنٹر قرار پایا تھا۔ چنانچہ محترم مولوی عنایت اللہ صاحب کے گھر میں ہم نے ڈیرہ ڈال دیا۔ جہاں صبح سویرے ہی ہم محمد دین کے تانگے پر سوار ہو کر ڈسکہ پہنچ جاتے جتنے روز ہم ڈسکہ جاتے رہے محمد دین کو ہم نے معطل کئے رکھا اور ہم آٹھ ہم جماعت باری باری تانگہ چلاتے رہے اور یوں سات آٹھ میل کا یہ سفر طوفانی ہو جاتا۔ ملک کا گھوڑا بہت سُبک رفتار تھا۔ ادھر ہم خوب زور زور سے اسے پچکارتے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا کہ وہ ہوا سے باتیں کرنے لگتا۔ ورنیکلر کا امتحان ختم ہُوا تو سکول کا امتحان شروع ہو گیا۔ پہلا پرچہ ریاضی کا تھا میں نے اس پر ایک سکھ اور ایک گھڑیال کی تصویر بنائی۔ گھڑیال کی سوئیاں بارہ کے ہندسہ پر ٹکا دیں اور نیچے کیپشن لکھا کہ "ورنیکلر کا امتحان دینے کے بعد سکول کا امتحان دینے والے کے بارہ بج گئے" پرچہ دیا اور آپ سکول سے ہی نہیں گھر سے بھی کئی روز کے لئے غائب ہو گیا۔ والد صاحب سخت گھبرائے کہ سکول کا امتحان نہیں دیا چودھری رحمت علی صاحب نے انہیں بتایا کہ اس کا ریاضی کا پرچہ بہت شاندار ہے، وہی کافی ہے۔ ابا نے اصرار کر کے دیکھ لیا۔ تو سخت غصے کا اظہار کیا لیکن میں وہاں ہوتا تو پھر تھا۔ کئی روز کے بعد انہوں نے مجھے نارووال سے آ پکڑا۔ دادی اماں نے شکرانے کے نفل پڑھے اور ابا کا غصہ بھی میرے بازیاب ہو جانے کی خوشی میں تحلیل ہو گیا ورنیکلر کی سند ملی تو میں خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ آج بھی یہ سند ایک یادگار کے طور پر محفوظ ہے کیونکہ یہ واحد دستاویز ہے جس پر میری تاریخ پیدائش درست لکھی ہوئی ہے ورنہ میٹرک کی سند پر ٹائپ کی غلطی نے مجھے اپنی مرحومہ دو سالہ بڑی بہن سے بھی دو ماہ بڑا بنا دیا ہوا ہے۔

جوش ملیح آبادی

حضرت جوش سے میری بالمشافہ گفتگو نہیں ہوئی۔ لیکن ٹی وی پر ان کا انٹرویو میں نے دیکھا اور سنا تھا اور ان کی "یادوں کی برات" درجنوں بار پڑھی ہے نوائے وقت جسے میں اپنا اخبار کہتا اور سمجھتا ہوں کوئی ایسا موقع کبھی ہاتھ سے جانے نہیں دیتا جس میں جوش کے لتّے لئے جا سکتے ہوں۔ سچی بات تو یہ ہے "نوائے وقت" کے اِن اداریوں اور مضامین نے مجھے جوش کے بارے میں سوچنے پر مجبور کیا اور میں نے اِن کے زندگی سے بھرپور گرما گرم سوانح پڑھ ڈالے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ رٹ ڈالے اس دور کی جو کتابیں میرے نزدیک پڑھنے کے قابل ہیں ان میں کرنل محمد خان کی "بجنگ آمد"، جوش کی "یادوں کی برات" اور حضرت احسان دانش کی "جہانِ دانش" اپنے معیار اور مضامین کے لحاظ سے ندرت کی حامل ہیں۔ کرنل محمد خاں کی ایک دوسری کتاب "بسلامت روی" بھی خاصی دل کش اور نادر مضامین پر مشتمل ہے لیکن اس میں وہ مولوی مدن کی سی بات پیدا نہیں ہو سکی۔ احسان دانش نے انتہائی غربت و افلاس میں آنکھ کھولی اور دنیا بھر کی مصیبتوں اور آزمائشوں سے گزرتے ہوئے آسمان پر چاند ستاروں کے ساتھ اپنا مقام بنایا اس کے بالکل برعکس جوش منہ میں سونے کا چمچہ لے کر دنیا میں آئے اور ایک زردار، سرمایہ دار عیاش نواب کی کامیاب زندگی بسر کرنے کے بعد مرنے کی آرزو دِل میں لئے ہوئے ابھی تک زندہ ہیں۔ میری دیانت دارانہ رائے یہ ہے کہ "جہانِ دانش" پڑھنے والوں نے اگر "یادوں کی برات" نہیں پڑھی تو انہوں نے یک طرفہ ٹریفک چلائی ہے۔ رات کے ساتھ اگر دن کو نہ دیکھا جائے تو دونوں میں تمیز کرنا بے حد مشکل امر ہے۔ "نوائے وقت" اور بعض دیگر حلقوں نے جوش پر کئی اعتراضات کئے ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں کہ وہ خدا، زاہد اور

مذہبی احساسات کا مذاق اڑاتا ہے۔ اپنی سرگزشت میں اس نے فحاشی و عریانی کو فخریہ انداز میں بیان کیا ہے میں سمجھتا ہوں کہ ان آرار کے قائم کرنے میں مبالغہ بہت حد تک دخیل ہے ورنہ جوش کے کلام میں مذہبی اعتقادات کا کہیں بھی ایسا مذاق نہیں ملتا جو اسے ملحد، کافر اور زندیق بنا دے۔ البتہ جوش کے دور میں اور اس سے پہلے بھی بیشمار شاعروں نے اپنے کلام میں جو شوخیاں کی سی ہیں اسی قسم

کی شوخیاں جوش کے کلام میں بھی جاتی ہیں۔ جس سے اس کی شاعرانہ عظمت مجروح نہیں ہوتی۔ یہ بالکل درست ہے اگر جوش یہ شوخیاں نہ کرتے تو شاید بہت بہتر ہوتا۔ لیکن جیسا کہ میں نے پہلے لکھا ہے منہ میں سونے کا چمچہ رکھنے والے اس قسم کی باتوں سے قطعاً بے نیاز ہوتے ہیں کہ لوگ انکے بارے... میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

بفرضِ محال جوش اگر کافر و زندیق ہے تو بھی ہماری صحت پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس دنیا میں لاکھوں ایسے بدقسمت افراد ابھی موجود ہیں جو خدا کے وجود کو تسلیم نہیں کرتے اور ان میں مشہور فلسفی برٹرینڈ رسل بھی شامل ہے۔ لیکن اس کے اس عقیدے کی بناء پر ہم اسے ایک عظیم فلسفی کی حیثیت سے خارج نہیں کر سکتے۔ جوش کی سب سے بڑی خوبی جو اس کے مخالفین کی نظروں میں سب سے بڑی خامی بن کر کھٹکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس نے اپنی زندگی میں وارد ہونے والے تمام گفتنی و ناگفتنی واقعات پورے دھڑلے سے بیان کر دیئے ہیں اور اس سلسلے میں کسی قسم کے تجاہلِ عارفانہ سے کام نہیں لیا۔ درحقیقت، اس کی سرگزشت ایک عہد

کی مکمل نہ سہی تو ایسی تاریخی داستان ضرور ہے جو معاشرتی و مجلسی زندگی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ تیسری اہم خصوصیت اس کی یہ ہے کہ شخصیت نگاری اور کردار نویسی میں جوش غالباً واحد قلم کار ہیں۔ جنہوں نے انسانی فطرت کی خوبیاں اور خامیاں دونوں نہایت دل کش انداز میں بیان کی ہیں۔ ورنہ بالعموم کردار نگار

حضرات آدم کے کسی بیٹے پر قلم اٹھاتے ہوئے اسے بشریت کے دائرے سے خارج کر دیتے ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں موجود ہیں جن میں علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کا اسمِ گرامی سرِفہرست ہے جن کی سیرت و سوانح پر مشتمل واقعات پڑھنے کے بعد خاکی وجود کے بجائے ان پر کسی فرشتے کا گمان ہونے لگتا ہے

جوش کی ایک اور خوبی (خامی) یہ رہی کہ اس نے اپنے ہم عصر چوٹی کے شاعروں اور ادیبوں کی شگفتہ انداز میں "چٹکیاں" بھی لی ہیں۔ اس کی بے شمار مثالیں اس کی آپ بیتی میں درج ہیں۔ ان "چٹکیوں" اور "شوخیوں" نے آئندہ نسل کے لئے جہاں تفریحِ طبع کے سامان پیدا کئے ہیں۔ وہاں ماضی کے ادبی ورثے میں بھی بیش بہا اضافہ کیا ہے مثال کے طور پر جگر مراد آبادی اور جوش کی باہمی رقابت کے نتیجے میں کلامِ جگر کا موازنہ کرنے یا اس سے بہتر کلام پیش کرنے کی کوشش میں جوش کے اشعار پڑھنے کی چیز ہیں۔ جگر کی اوّل تو ہر غزل پڑھنے کے قابل ہے لیکن ان دنوں جگر کی اس غزل کا بہت غلغلہ تھا ؎

نیاز و ناز کے جھگڑے مٹائے جاتے ہیں ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

جوش نے اس کے مقابلے میں لکھا۔

اگرچہ پہلوئے ذم ہے مگر بقولِ جگر ہم ان میں اور وہ ہم میں سمائے جاتے ہیں

اسی طرح جگر کی ایک اور غزل کا شعر ہے ؎

وصل سے شاد کیا۔ ہجر سے ناشاد کیا اس نے جس طرح سے چاہا، مجھے برباد کیا

جوش نے اس پر یوں چوٹ کی ؎

کچھ نہیں اس کے سوا جوش حریفوں کا کلام وصل سے شاد کیا ہجر سے ناشاد کیا

جیب تراش محافظ

سرائے سلطان سے باہر چار محنتی دوستوں نے باہمی اشتراک سے اتحاد فونڈری کے نام سے ایک وسیع کارخانہ بنا رکھا تھا۔ یہ دوست حاجی حسن محمد شیر محمد، گل محمد اور ملک چنن دین تھے۔ اس فونڈری میں ڈیزل انجن بنتے تھے جو دُور دراز کے علاقوں یہاں تک کہ سندھ کے اندرونی قصبوں اور دیہات تک جاتے تھے چچا عبداللہ خاں فوج سے ریٹائر ہونے کے بعد یہاں ملازم ہو گئے تھے اور انھوں نے اپنی رہائش بھی اس کے ایک بالائی کمرے میں رکھ لی تھی۔ میں بھی اکثر اتحاد فونڈری جاتا تھا۔ دھیرے دھیرے چچا کے علاوہ میں بھی اس کے مالکان کا "سلیپنگ فرینڈ" بن گیا ایک روز ایک سندھی وڈیرا اپنے دو تین نوکروں کے ہمراہ فیکٹری میں آیا۔ ان دنوں ڈیزل انجن کی قیمت صرف چھ ہزار روپے تھی۔ اس نے کہا کہ اسے ایک انجن چاہیئے لیکن رقم اس سے کہیں صرف ہو گئی ہے وہ سندھ سے رُوپے بھیج دے گا۔ نہ جان نہ پہچان، حاجی حسن اور گل محمد متذبذب ہو گئے۔ مجھے خدا جانے کیا سُوجھی، میں نے چچا سے کہا کہ انجن دے دیا جائے۔ وہ کہنے لگے ذمہ داری تمہاری ہوگی میں نے کہا ٹھیک ہے۔ میں اس رقم کی ضمانت دیتا ہوں۔ سندھی ٹرک پر انجن لاد کر لے گیا۔ اس سے ایک رسید لکھوالی گئی۔ کہ وہ اپنے گھر پہنچ کر رقم بھیج دے گا۔ ایک ماہ گزرا، دو ماہ ہو گئے۔ مگر رقم نہ آئی جب کہ اس کا وعدہ

وعدہ تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر رقم پہنچ جائے گی۔ حاجی صاحب نے چچا سے کہا۔ چچا بہت پریشان ہوتے بالآخر فیصلہ کیا گیا کہ سندھی وڈیرے کی گوٹھ" سے رقم لائی جائے چنانچہ اس غرض سے رختِ سفر باندھنا پڑا۔ سندھی رئیس اپنے ڈیرے پر کشادہ پیشانی سے ملا۔ حال احوال پوچھا کہ کیسے آنا ہوا۔ بڑی حیرت ہوئی کہ اسے ڈیزل انجن یاد نہیں۔ اسے بتایا کہ جناب وہ رقم ابھی تک نہیں ملی کہنے لگا "ہائیں۔ سائیں وہ تو میں نے یہاں آتے ہی بھیج دی تھی،

کہاں ہے "منشی"۔ منشی کانپتا لرزتا آیا اور کہنے لگا کہ ان کی رقم میں فلاں جگہ خرچ کر چکا ہوں۔ بس اب بھیجنے ہی والا تھا۔ سندھی کو بڑا تاؤ آیا۔ وہ کسی ضروری کام سے ایک دو روز کے لئے حیدر آباد جا رہا تھا۔ منشی سے کہنے لگا کہ واپسی پر تمہارا انتظام کروں گا۔ فی الحال مہمان کی خدمت کرو اور صبح رقم دے کر اسے رخصت کرو منشی اور وڈیرے کے کارندوں نے خوب تواضع کی اور سرِ شام ہی ایک کمرے میں بستر لگا دیا۔ اتنے میں ایک آدمی آیا اس نے اپنے "نیفے" سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر منشی کے میز پر ڈھیر کر دیں۔ منشی کا کمرہ میرے کمرے اور بستر کے بالکل سامنے تھا۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا وہ صاف نظر آ رہا تھا۔ منشی نے وہ گڈیاں اٹھائیں اس میں کئی نوٹ بلیڈ سے کٹے ہوئے تھے وہ اس نے الگ کر کے الماری کے نچلے خانے میں پھینک دیئے باقی رقم کے تین چار برابر حصے کئے اور ایک حصہ لانے والے کو دے کر چلتا کیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک لمبا تڑنگا آدمی کمبل اوڑھے آیا اس نے بھی نوٹ نکالے اور اپنا حصہ وصول کر کے چلا گیا۔ جب تک اندھیرا اچھی طرح چھا گیا۔ تاہم چند مزید آدمی باری باری بعد ازاں بھی آتے جاتے رہے۔

اگلی صبح منشی نے چھ ہزار دو صدر وپے (دو صد روپے کرایہ بطور جرمانہ، جیسا کہ وڈیرے نے ہدایت کی تھی) گن کر کہا کہ رقم وصول کر لیجئے۔ رات کی کارروائی نظروں کے سامنے تھی۔ جس کی روشنی میں یہ نتیجہ نکالنا مشکل امر نہ تھا۔ کہ منشی نے کئی جیب تراش ملازم رکھے ہوتے ہیں۔ لہذا رقم ادا کرنے کے بعد اس کا منشی تک

واپس پہنچ جانا بعید از قیاس نہ تھا۔ اس خیال کو مزید تقویت یوں ملی تھی کہ رات اپنا حصہ وصول کرنے والا ایک جیب تراش صبح ہی سے ڈیرے میں موجود واپسی کے پروگرام کا جائزہ لے رہا تھا۔ منشی نے دو تین بار کہا کہ رقم پوری کر لیں مگر میں ٹس سے مس نہ ہوا۔ بالآخر کہنے لگا کیا بات ہے؟ میں نے کہا وڈیرے صاحب آ جائیں تب یہاں سے جاؤں گا۔ وہ جاتے ہوئے مجھے رُکنے کا کہہ گئے تھے۔

اگلے روز وڈیرا آیا تو منشی پر لال پیلا ہو گیا کہ اس نے مجھے رُخصت کیوں نہیں کیا! میں نے کہا جناب اس کا جواب میں دیتا ہوں۔ ذرا منشی کے کمرے تک میرے ساتھ چلیے۔ وہ حیرت زدہ سا ہو کر میرے ہمراہ منشی کے کمرے میں آیا تو میں نے کہا اس کی الماری کا سب سے نچلا خانہ دیکھیے۔ اس نے الماری کھولی تو نیچے والے خانے میں بلا مبالغہ سینکڑوں کٹے پھٹے نوٹوں کا ڈھیر پڑا ہُوا تھا جن میں سے ایک سے سو روپے تک کے نوٹ تھے۔ دریں اثنا منشی کا رنگ ہلدی سے بھی زیادہ زرد پڑ چکا تھا۔ وڈیرے نے سوالیہ نگاہوں سے میرے اور منشی کی جانب دیکھا۔ میں نے کہا جناب اس نے جیب تراش رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے رقم اس لئے نہیں لی کہ انہوں نے مجھے لاہور تو کیا نواب شاہ تک بھی نہیں جانے دینا تھا اور یہ رقم نکال لینی تھی۔ وڈیرے نے ہنٹر اٹھایا اور منشی کی مرمت شروع کر دی۔ جس نے بتایا کہ اس نے چھ جیب تراش رکھے ہیں۔ ایک حصہ پولیس کو جاتا ہے ایک فلاں کو جاتا ہے اور باقی رقم برابر تقسیم کی جاتی ہے۔ وڈیرا کہنے لگا کہ چھ ہزار دو صد روپے کی یہ رقم لاہور میں اتحاد فونڈری کے اندر پہنچ جانی چاہیئے۔ باقی تمہارا اور تمہارے جیب تراشوں کا انتظام میں خود کر لوں گا۔ منشی نے رقم اٹھائی۔ ایک آدمی (جیب تراش) میرے ساتھ کیا اس نے حیدر آباد سے میرے لئے سیٹ ریزرو کروائی اور کہنے لگا کہ یہ پوٹلی آپ اپنے سرہانے رکھ کر آرام سے سو جائیں اس کی کوئی فکر نہ کریں یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ پڈعیدن میں ان کا ایک ساتھی میرے لئے انڈے اور چائے لایا۔ سمہ سٹہ سے خانیوال تک ان کے ایک اور ساتھی نے میرا اور رقم کا خیال رکھا۔ لاہور ریلوے سٹیشن سے ایک آدمی میرے ساتھ ہو لیا اور فونڈری کے گیٹ پر کہنے لگا "بابو جی رقم ٹھیک ہے نا؟"

چودھری احمد سعید

ملک کے کئی عظیم صنعتی اداروں جن میں سروس انڈسٹریز اور سروس ٹیکسٹائل ملز بھی شامل ہیں، کے ڈائریکٹر کی حیثیت میں چودھری احمد سعید کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ انہیں صنعتی معاملات کو خوش اسلوبی سے چلانا ورثے میں ملا ہے انتظامی قابلیت اور پیشہ وارانہ صنعتی مسائل کے لحاظ سے چودھری احمد سعید ایک بلند مقام پر فائز نظر آتے ہیں۔ معاشرے اور سوسائٹی میں کارِ خیر کے بل بوتے پر بھی انہوں نے نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں۔ انہوں نے رفاہِ عامہ کے کئی اداروں کی داغ بیل ڈالی ہے اور ان کے مصارف برداشت کئے ہیں۔ قومی اخبارات تو ان کے اداروں کے اشتہارات کو اپنا حق سمجھتے ہی ہیں۔ مگر چودھری صاحب کی یہ خوبی ہے۔ کہ علاقائی صحافت کو زندہ رکھنے میں بھی انہوں نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ گردشِ زمانہ کے اسیر اور مصیبت میں گرفتار احباب اکثر و بیشتر ان کی ہمدردیاں حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ شرط یہ ہے کہ ان تک رسائی ہو جائے جو عملاً ناممکن نہیں تو از حد مشکل کام ہے۔ کیونکہ وہ اکثر کاروباری دوروں پر یورپ اور امریکہ کے سفر پہ ہوتے ہیں۔ جہاں ان کی شبانہ روز مساعی کے طفیل سروس کی مصنوعات نے اچھی خاصی مارکیٹ بنالی ہے اور وہ ملک کے لئے کثیر زرمبادلہ کمانے میں قابلِ ذکر حد تک کامیاب ہیں۔

میں گزشتہ سال جب اپنے قریب المرگ پہنچا دینے والے پریشان کن گھشہ بلوہ

حالات سے دوچار ہوکر ان سے ملا تو انہوں نے میری اہلیہ کے وہ میڈیکل بل ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ جو گزشتہ کئی ماہ سے میری جیب میں پڑے ہوتے تھے۔ بعد ازاں جب ہمارے ایک صحافی "دوست" کو ان کی اس پیش کش سے خدا جانے کیا سُوجھی۔ اس نے یہ بتایا کہ چودھری صاحب مجھ سے سخت نالاں ہیں۔ تو میں نے ان سے نہ ملنے کا فیصلہ کیا۔ اس واقعہ کے تین چار ماہ کے بعد ایک تقریب میں ان کا اور میرا آمنا سامنا ہوگیا تو وہ کہنے لگے کہ آپ وہ بل کیوں نہیں لائے۔ میں نے کہا کہ فلاں "دوست" نے بتایا تھا کہ آپ مجھ سے سخت نالاں ہیں۔ اس پر انہوں نے لفظ دوست اور ان کی فطرت کی خوب تشریح اور وضاحت کرنے کے بعد فرمایا کہ "آپ وہ بل لے آئیں"۔ چنانچہ میں چند روز کے بعد وہ بل لے کر گیا تو انہوں نے فوراً ان کی ادائیگی کا حکم دیا جب کہ ان کا کیش آفس بند ہو رہا تھا۔ کیشئر نے ان کے حکم کی تعمیل کی اور یوں میری خالی جیبوں میں تین ہزار تین صد روپے کی رقم جھُولنے لگی۔ جب میرے اس "دوست" کو اس کا علم ہوا تو کہنے لگا۔ سردس اور چودھری احمد سعید کے لئے اتنی سی رقم کیا حیثیت رکھتی ہے؟ میں نے کہا "قربان جاؤں۔ یہ رقم ان کے لئے واقعتاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی مگر موجودہ حالات میں میرے لئے یہ قارون کے خزانے سے کسی طرح کم نہیں"۔

چودھری احمد سعید نے مجھے پابند کیا تھا کہ میں ان کی اس نوازش کا تذکرہ کسی سے نہ کروں مگر کیا کروں "خدا اور اس کے رسُول کا فرمان ہے کہ جو اس کے بندوں کا شکرگزار نہیں وہ میرا بھی شُکرگزار نہیں"۔

چودھری شجاعت حسین + پرویز الٰہی

جن دنوں چودھری ظہور الٰہی جیل میں تھے۔ ان کی کوٹھی سے "دو ہیرے" برآمد ہوتے۔ ان میں ایک ان کا بیٹا شجاعت حسین اور دوسرا ان کا داماد اور بھتیجا پرویز الٰہی ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے بہنوئی ہیں۔ جڑواں کوٹھیوں میں رہتے ہیں۔ بالعموم ایک ساتھ سفر کرتے ہیں۔ دفتر میں، مل میں، جہاں جاتے ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے جڑواں بھائی ہوں۔ دونوں میں بے مثل اور حیران کن حد تک ہم آہنگی اور یگانگت پائی جاتی ہے اگر آپ انتہائی پرائیویٹ بات چودھری پرویز الٰہی سے کریں گے تو اس کا جواب کچھ دیر کے بعد یا اگلی ملاقات میں چودھری شجاعت حسین آپ کو دے رہے ہوں گے۔

چودھری ظہور الٰہی میں جس قدر خوبیاں ہیں وہ سب ان "جڑواں بھائیوں" میں موجود ہیں۔ البتہ ان کی خامیاں ان میں نظر نہیں آتیں۔ دونوں بے حد ہمدرد، مخلص اور بے غرض ہیں۔ البتہ بڑے لوگوں کی مانند آمد و خرچ کا جو تخمینہ بناتے ہیں۔ اس سے آنکھیں بند نہیں کرتے اور بجٹ کو بالکل سیدھا رکھتے ہیں۔

میں ان کے ہمراہ ٹانڈہ، سگر، بجکیٹر (اصل نام چک بزرگ ہے۔ کسی بے ادب چھوٹے نے اسے بجکیٹر بنا دیا ہے) وغیرہ جگہ پر گیا ہوں۔ وہاں ان کے پوشیدہ جوہر کھلے تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ لوگ اچھے منتظم اور بہترین کاروباری ہی نہیں بلکہ بوقتِ ضرورت بہت اچھے لب و لہجے میں، مختصر اور مدلل تقریر اور گفتگو بھی کر سکتے ہیں۔ جب کہ بڑے چودھری صاحب عام لوگوں سے نجی ملاقاتوں میں بے حد مختصر وقت دیتے ہیں مگر محفلوں میں اپنی تقریر کو شبِ فراق سے بھی لمبا کر دیتے ہیں۔

چودھری غلام احمد

گجرات کے وکلاء میں شرافت، نجابت، محبت، اخلاص اور پیشہ وارانہ مہارت کے لحاظ سے چودھری غلام احمد ایڈووکیٹ ممتاز اور منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ اِن کی پُرخلوص مسکراہٹ ان کے کردار کی مضبوطی کی آئینہ دار ہے جب بات کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے شکر پاروں کی بارش ہو رہی ہے جسم جتنا دُبلا ہے اُتنا ہی قد لمبا ہے۔ قد سے زیادہ اخلاق اُونچا ہے اور اس کی مناسبت سے زبان بے حد شیریں ہے۔ کچہری اور عدالتوں سے فارغ ہونے کے بعد اتنا سادہ لباس پہنتے ہیں کہ کسی کو یہ گمان ہی نہیں ہو سکتا کہ یہ اتنے اعلیٰ پائے کے وکیل ہیں۔

چودھری محمد سرور جوڑا

جوڑا صاحب کو اگر گجرات کی اہم ترین مقبول عام شخصیت کہا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ بنیادی جمہوریت کے وہ واحد رکن ہیں جن کے نام کا بورڈ صدر ایوب خان کے دور سے بنیادی جمہوریت کے حالیہ نظام نو تک یونین کمیٹی کے عہدیدار کی حیثیت سے ان کے سابقہ دفتر کے سامنے پوری آن بان سے لٹکتا رہا ہے اس لحاظ سے بجا طور پر انہیں یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے بنیادی جمہوریت کے نظام کو زندہ رکھا تاآنکہ قوم کئی قسم کے تجربات کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس کی عدم موجودگی میں ہمارے مسائل کا حل ممکن نہیں۔

بنیادی جمہوریتوں کے حالیہ انتخابات میں انہیں "حقہ" کا نشان الاٹ ہوا تھا۔ جہاں باقی امیدواروں نے پوسٹروں یا زیادہ سے زیادہ بینروں کے ذریعے اپنے نشانات کی تشہیر کی۔ جوڑا صاحب نے اپنی افتادِ طبع کے عین مطابق پبلسٹی کا انوکھا وسیلہ دریافت کرتے ہوئے تقریباً بیس فٹ لمبا اور اتنا ہی چوڑا "حُقہ" بنوا کر اپنے سینما کے لان میں یعنی شہر کے عین وسط میں نصب کر دیا۔ اس حُقے کی "نڑی" کو تو طویل ہونا ہی چاہیئے تھا۔ سو وہ خاصی لمبی تھی۔ مگر اس کی قابلِ ذکر چیز اس کا "نیچا" تھا جو عام استعمال میں آنے والے مٹی کے گھڑے سے تقریباً دوگنا تھا۔ حقے پر پچی کاری کے دیدہ زیب نمونے بھی بنائے گئے تھے۔ لوگ بہت بڑی تعداد میں روزانہ اس "حقے" کو دیکھ دیکھ کر حیرت و استعجاب اور مسرت کا اظہار کرتے تھے اور یوں جوڑا صاحب جو جلسوں جلوسوں میں دل پسند حرکات و سکنات سے لوگوں کا دل موہ لینے میں اور اپنا گلا بیٹھا لینے میں کامیاب ہوا کرتے تھے یا جوشِ تقریر میں گھی کے ڈبوں کی بارش کرکے اپنے حق میں راہ ہموار کیا کرتے تھے۔ اس بار انہوں نے پبلسٹی کی یہ خاموش مگر ہنگامہ خیز مہم نصف بیس فٹ لمبا چوڑا حقہ بنا کر ہی جیت لی۔

جوڑا صاحب صرف عام لوگوں میں ہی پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھے جاتے بلکہ نوجوان طبقہ بالخصوص فلم بین حضرات ان کے خاص طور پر مدّاح ہیں۔ کیونکہ جب کبھی ان کو مفت فلم دکھانے کا دورہ جنون کی حد تک پڑتا ہے تو یہ طبقہ اس سے پورا پورا فائدہ اٹھاتا ہے۔ فریقین کے اس باہمی ربط وضبط نے جوڑا صاحب کو ہمیشہ ہی جاں نثاروں کے ہراول دستے مہیا کئے ہیں جو بوقت ضرورت انہیں کندھوں پر اٹھائے شہر میں لئے اڑتے پھرتے ہیں

جوڑا صاحب کا غصّہ بھی معرکے کی چیز ہے۔ "مغضوص علیہ" کی شان میں اس حالت میں جو "قصیدے" وہ پڑھ جاتے ہیں انہیں بہ امرِ مجبوری سُنا تو جا سکتا ہے قلم بند نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی وہ حد درجہ مہمان نواز اور ایک حد تک فیاض آدمی ہیں۔ ان کا ڈیرا بستر اور ٹی وی سمیت اسی مذکورہ سینما کے ایک کمرے میں ہوتا ہے جس کی کھڑکیوں پر دروازوں کی جگہ درجنوں ایسے ہار پڑے ہوئے ہیں جو مختلف انتخابات میں کامیاب ہونے کے بعد ان کے مداحوں نے انہیں پہنائے ہوتے ہیں۔ ان ہاروں کی بوسیدگی یا تازگی سے اِن کے پہنائے جانے کی تاریخیں نکالی جا سکتی ہیں اور اس کے لیے آثار قدیمہ میں مہارت رکھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔

حاجی صاحب محمد صدیق

صحافت میں پرانے اور قدیم ہونے کے باوجود قدامت پسند نہیں ہیں۔ چہرہ وضع قطع اور چال ڈھال البتہ وہی پرانی ہے۔ صرف بال چاندی کی طرح سفید ہو گئے ہیں جیسے خوش مزاج آج سے تیس چالیس برس پیشتر تھے۔ آج بھی ہیں۔ برجستہ فقرے چست کرنے میں حاجی صاحب کا جواب نہیں آپ بھی بذلہ سنج ہیں اور دوسروں سے بھی اس کی توقع رکھتے ہیں۔ اپنی سنیارٹی اور بزرگی کی دھونس جمانے کی انہیں عادت نہیں۔ بے تکلفی سے یوں پیش آتے ہیں گویا کبھی کلاس فیلو رہے ہیں۔ فطرتاً مجلسی آدمی ہیں۔ لطیفے یوں چھوڑتے ہیں جیسے شادی بیاہ کے موقعوں پر پٹاخے۔ دفتر میں دوپہر کے کھانے کا اہتمام اس طرح کرتے ہیں گویا دس بارہ مہمان ڈائیننگ ہال میں کھانے کا انتظار کر رہے ہوں۔ ایک عرصہ تک ان کا کولیگ رہنے کے دوران لقب یا عرف "حاجی" کی وجہ تسمیہ دریافت کرنا ہر بار بھول جاتا رہا ہوں مگر سننے میں آیا ہے کہ حاجی صاحب بمبئی میں اس سمندر میں غوطہ لگا آئے تھے جس کے ایک دوسرے کنارے پر جدّے کی بندرگاہ واقع ہے۔ ایک اور ثقہ روایت کے مطابق حاجی صاحب سے کسی نے اس ٹائیٹل کے بارے میں دریافت کیا تو انھوں نے حسبِ معمول شگفتہ لہجے میں کہا کہ "یہ ٹائٹیل مجھے ایک اصلی حاجی نے دیا تھا جس کی میں نے بہت "خدمت" کی تھی۔ اگر آپ کو بھی اس "قیمتی ٹائیٹل کی ضرورت" محسوس ہوتی ہو تو آپ کو میری "خدمت" کرنا ہوگی" دروغ بر گردنِ پیخند ؎

حکیم آفتاب احمد قرشی

بیڈن روڈ پر جہاں آج سے کچھ عرصہ قبل حکیم آفتاب احمد قرشی مطب کرتے تھے۔ اب اس کے ایک حصے میں بینک اور بلند و بالا عمارت تعمیر ہو چکی ہے جب کہ دُوسرے حصے میں اس عمارت سے بھی اُونچی شخصیت حکیم صاحب تشریف فرما ہیں۔ برِصغیر کے نامور طبیب اور شہرۂ آفاق معالج حکیم محمد حسن قرشی کے یہ لائق و فاضل فرزند اپنے پیشہ وارانہ فرائض اور خدمتِ خلق کے کاموں کے علاوہ سماجی اور مجلسی زندگی میں بھی فعال حصّہ لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اکثر ان کا مطب کھُلا ہوتا ہے اور ملاقاتی، جن میں جسمانی مریضوں کے علاوہ علمی، نفسیاتی اور "محفلی" مریض بھی ہوتے ہیں ان کے منتظر ہوتے ہیں مگر حکیم صاحب کا کچھ پتہ معلوم نہیں ہوتا۔ اگلے روز کے اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی جلسے یا مشاعرے میں مدعو تھے اور وہاں وہ اپنے خیالات کا اظہار کر رہے ہیں (بزبانِ حال۔ کیونکہ چوکھٹے میں ان کی تصویر سجی ہوتی ہے)

لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس کے موقع پر میں نے ایک کتابچہ انگریزی عربی اور اُردو میں شائع کیا تھا۔ حکیم صاحب نے وہ کسی سٹال پر دیکھا اور اسے بے حد پسند کرتے ہوئے خاصی حوصلہ افزائی فرمائی۔

تحریکِ پاکستان میں انہوں نے مسلم نوجوانوں کی نمائندگی کی تھی اور اس سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے جو کام کیا اور جس رنگ میں کیا اور جس جذبے سے کیا وہ ہماری ملّی تاریخ کا ایک ناقابلِ فراموش باب ہے۔

حکیم عبدالرشید جیلانی

حکیم صاحب مطب بھی خوب کرتے ہیں مہمان نوازی بھی اور باتیں بھی۔ اپنی خوب صورت گفتگو کو مشاہیرِ ادب کے کلام اور اُستاد سے وزن دار اور طرح دار بناتے ہیں۔ دوستوں اور مستحق غرباء سے فیس تو کیا ادویات کی اصل قیمت لینا بھی بھول جاتے ہیں۔ کردار اور اخلاق میں جتنے خود اُونچے ہیں اتنا ہی اُونچا سُنتے ہیں۔ مگر اپنے مریضوں کی شکل دیکھ کر ہی نسخہ تجویز کرنے کی قابلیت اور ملکہ خداداد پایا ہے۔ کئی کتابوں کے مصنّف ہیں۔ طب سے متعلقہ ان کی تمام تصانیف علمی و ادبی طور پر بھی بلند پایہ ہوتی ہیں حکیم صاحب کو خوب صورت اور دیدہ زیب کتابوں سے جو عشق ہے اس کا اظہار ان کی تصانیف سے بخوبی ہوتا ہے جو ظاہری شکل و صورت اور ٹیپ ٹاپ کے لحاظ سے بے حد دل کش ہوتی ہیں۔ جس طرح بات کو طول دیتے چلے جاتے ہیں بعینہٖ اپنی تحریر اور مضمون کو بھی طویل تر بنا دیتے ہیں۔ بالخصوص مضمون کے شروع میں جملوں کی تان بڑی مشکل سے توڑتے ہیں۔ جس سے بعض اوقات قاری اُلجھنوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ مگر جب ابتدائی پیراگراف سے قلم آگے نکلتا ہے تو اسپِ تازی بن کر ہوا ہو جاتا ہے

دوستوں کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ بڑے بھائی کا ادب کرنے کے سلسلے میں نئی نسل کے لئے بہترین مثال ہیں۔ دوسروں پر خرچ کر کے بے حد خوش ہوتے ہیں علم طب و حکمت اور عامۃ الناس کی خدمت میں مصروف رہنا حکیم صاحب کی زندگی کے مقاصد ہیں اور تمام اخبارات کے دفاتر کا چکر لگانا اور حالات حاضرہ سے آگاہ ہونا ان کے معمولات میں شامل ہے جب بات کر رہے ہوں گے تو کیا مجال کہ مخاطب کو اپنی نظر چرانے کا موقع دیں دورانِ گفتگو بار بار لمبی سی "جی! واللہ" کہہ کر آپ بھی وقفہ کرتے اور مخاطب کو بھی سانس لینے کے سنہری مواقع فراہم کرتے ہیں۔

حکیم نثار احمد قریشی

لالہ موسیٰ کا سب سے پُرانا صحافی ہے اب اس نے کیمرے کا پراجیکٹ بھی کھول لیا ہے۔ جس میں اس کا فرزند ارجمند اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتا ہے جہاں کوئی تقریب یا فنکشن ہو۔ باپ بیٹا مع کیمرے کے وہاں جاتے ہیں لالہ موسیٰ کی دوکانوں پر جتنی فلمیں دستیاب ہوں وہ بھی ہمراہ لے لیتے ہیں اور اس تقریب کو کور کرنے کے لئے یہ تمام فلمیں استعمال کر ڈالتے ہیں۔ پھر اپنے پلّے سے مزید رقم خرچ کر کے ملک میں شائع ہونے والے تمام اخبارات کو اس کی تصویریں بھجواتے ہیں جو ہفتہ عشرہ میں یکے بعد دیگرے چھپ چھپ کر سامنے آتی رہتی ہیں اور یوں حکیم صاحب انہیں دیکھ دیکھ کر اپنا خون بڑھاتے اور اپنی جان بناتے رہتے ہیں۔ لاہور جانے کا پروگرام بن جائے تو حکیم صاحب دوستوں سے بہت پہلے ریلوے اسٹیشن یا بسوں کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک پھٹا پرانا بازار سے سبزی لانے والا تھیلا بھی ہوگا۔ گاڑی آئے گی تو سبھی ہنستے مسکراتے اس میں سوار ہو جائیں گے۔ راستے میں کسی سٹیشن سے وُہ اچانک غائب ہو جائیں گے۔ دوستوں کو ان کی اس اچانک مفارقت پر بہت دُکھ ہوگا۔ لاہور سے واپسی کے دس پندرہ روز بعد ان سے ملاقات ہوگی اور ان کی اچانک گمشدگی کا سبب پوچھا جائے گا۔ تو فرمائیں گے کہ گاڑی میں ایک شخص نے مجھ سے پوچھا تھا کہ اس تھیلے میں کیا ہے؟ کیا اس کو یہ معلوم نہیں تھا کہ اس میں کیمرہ تھا!! ٭

حمید اصغر نجید

"نوائے وقت" سے مجید نظامی نے عارضی طور پر ناطہ توڑا اور "ندائے ملت" نکالا تو ہیں بھی ان "مہاجرین" میں شامل تھا جنہیں شاہ دین بلڈنگ سے منشی چیمبرز میں جانا پڑا یہاں بہت سے جو نئے دوست ہمارے کولیگ بنے ان میں حمید اصغر نجید بھی شامل تھے۔ کئی برس تک فیصل آباد میں صحافت کرنے کے بعد برسہا برس شعلہ بیان مقرر بے مثل ادیب اور منفرد قلم کار آغا شورش کاشمیری کے ساتھ چٹان میں کام کرنے کے بعد وہ "ندائے ملت" میں آئے۔ ان دنوں مجید نظامی اکثر و بیشتر میرے ناچیز مشوروں کی قدر کیا کرتے تھے۔ چنانچہ بیشتر احباب جن میں اے آر خالد، رانا جہانگیر وغیرہم بھی تھے کے بارے میں انہوں نے میری رائے دریافت کی تھی مگر حمید اصغر نجید کو میں نے دیکھا کہ وہ سیدھے مجید صاحب کے کمرے میں گئے۔ واپس آئے اور کام کرنے لگے۔ بعد ازاں مجھے پتہ چلا کہ وہ آغا شورش کے خاص آدمی ہیں اور چٹان میں مدیر معاون کے طور پر کام کرتے رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کے بارے میں اس سرٹیفکیٹ کے بعد مزید وضاحت کی کوئی گنجائش نہ تھی۔

میں ایک روز منشی چیمبرز کے باہر کھڑا تھا کہ ایک خوب صورت دل کش سا نوجوان ایک مضمون لئے ہوئے آیا اور کہنے لگا کہ کیا میرا یہ مضمون اخبار میں چھپ سکتا ہے۔ میں نے مضمون اس کے ہاتھ سے لے لیا اور کہا کیوں نہیں۔ چنانچہ وہ مضمون اخبار میں چھپ گیا اور پھر وہ نوجوان متواتر آنے جانے لگا اور چند ہی روز کے بعد پتہ چلا کہ اس نے ملازمت کے لئے درخواست دی ہے یہ نوجوان اے آر خالد تھا اسی طرح کوہستان کے سابق جنرل مینجر رانا جہانگیر ان دنوں سخت پریشان حال اور بے کار تھے ان کو میں نے خود مشورہ دیا کہ وہ نظامی صاحب کو درخواست دیں چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ ان دونوں حضرات کے بارے میں نظامی صاحب نے مجھ سے بطور خاص دریافت کیا تھا۔ بعد ازاں یہ دونوں حضرات کام پر لگ گئے

مگر نجید صاحب کے بارے میں مجھ ایسے سطحی انسان سے پوچھنے کی ضرورت ہی کیا تھی کیونکہ نجید صاحب کوالٹی اور کوانٹٹی دونوں اعتبار سے نظامی صاحب کے زیادہ قریب تھے۔

حمید اصغر نجید "ندائے ملّت" اور بعد ازاں "نوائے وقت" کے لئے کتنے مفید اور اہم ثابت ہوئے۔ اس کی گواہی تو ان اخبارات کے مالکان دیں گے جن کے لئے بے حد محنت و مشقت اس شخص نے کی۔ میں تو صرف اس کے اس پہلو کی نشاندہی کروں گا جس کا تعلق ایک انسان اور دوست سے ہوتا ہے اگر میں یہ کہوں کہ "ندائے ملت" میں حمید اصغر نجید کی شمولیت سے ایک ایسا شخص ہمارے ساتھیوں میں آ ملا جس کی دوستی محبّت اخوت اور عظمت بے مثل اور بے نظیر ہے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ بہترین قلم کار ہونے کے باوجود یہ شخص سگریٹ تک نہیں پیتا.. متواتر رات کو نیوز پر ڈیوٹی دینے کے باوجود تھکنے کا نام نہیں لیتا وقتاً فوقتاً تین بیویوں کا شوہر ہونے کے باوجود ایک درمیانی عرصہ میں سالہاسال تک مجرد رہنے پر بھی کسی اخلاقی گراوٹ کا شکار نہیں ہُوا اور مسکراہٹ اس کے لبوں سے غائب نہیں ہوئی یہ سب اس کی گو ذاتی خوبیاں ہیں مگر معاشرے اور سوسائٹی پر بے حد خوش گوار اثر ڈالتی ہیں اس کی اور قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ نبی اکرمؐ کے ارشادات کے مطابق دوستوں اور عزیزوں یہاں تک کہ منی لقوں کا بھی بھوکا رہنا برداشت نہیں کرتا۔ مقروض ہونے کی صورت میں قرضہ چکانے کی فکر میں لگا رہتا۔ مگر دوسروں کو قرضہ دینے کے بعد اُسے بھلا دینے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ انتہائی وسیع القلب اور کشادہ ذہن کا مالک ہے اس کے اعصاب بلاشبہ فولادی اور قوت ارادہ چٹان جیسا ہے اور کیوں نہ ہو آخر چٹان سے اس کا گہرا ربط اور تعلق رہا ہے اگر کسی ایسے ملک کی صحافت سے وابستہ ہونا جہاں محنتی، مخلص اور دیانت دار صحافیوں کو قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے تو یقیناً حمید اصغر نجید سونے میں تُلتا ۔

حمید جہلمی

میں سگریٹ نہیں پیتا مگر حمید جہلمی سے ملنے جن دنوں "امروز" کے دفتر میں ہفتے میں ایک آدھ بار جایا کرتا تھا اور وہ نہایت محبت سے سگریٹ کی ڈبیہ پیش کیا کرتا تھا تو اس کی اس پیش کش کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت جانتے ہوئے ایک سگریٹ اس میں سے کھینچ کر سُلگا لیا کرتا تھا اور ایک دو کش لینے کے بعد موقع غنیمت جان کر اسے بجھا کر بقیہ ٹوٹا جیب میں سنبھال لیا کرتا تھا۔ اس نے میری "تیز رفتاری" پر شاید دل ہی دل میں کبھی سوچا ہو۔ لیکن جب وہ مجھے فارغ دیکھتا۔ جھٹ سے ڈبیہ میری طرف بڑھا دیتا اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوتا کہ جب میں ایک آدھ گھنٹے کے بعد اس کے کمرے سے باہر آتا تو میری جیب میں پون سگریٹ کے چار پانچ ٹوٹے ضرور ہوتے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب وہ ہارون سعد کے ساتھ والے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا کرتا تھا۔ بعد ازاں جب سے وُہ نئے پُر تکلف کمرے میں منتقل ہوا۔ جس کے دروازے پر ایک عدد چپڑاسی اسے کھولنے اور بند کرنے کے لئے مامور ہے۔ میں نے اس کے اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کی۔ ایک دفعہ وہ مجھے چودھری ظہُور الٰہی کی کوٹھی پر اس روز ملا جب چودھری صاحب نے مشرقی پنجاب سے آئے ہوئے "سکھوں کے ایک وفد" کی دعوت کی تھی۔ میں نے حمید جہلمی سے کہا کہ چودھری صاحب نے تو سکھوں کی دعوت کی ہے۔ آپ یہاں کیسے؟ تو وہ بہت محظوظ ہوا اور بعض دیگر جھگڑالو قسم کے صحافیوں کی مانند اس نے مجھ پر جوابی حملہ نہ کیا۔ دریں اثناء اس کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف لپکتا دیکھ کر مجھے اس کے اس سگریٹ یاد آ گئے۔ اور میں جلدی سے وہاں سے کھسک کر ایک دوسری سیٹ پر جا بیٹھا۔ اتنے میں بعض جغادری قسم کے

صحافی اور ایڈیٹر صاحبان بھی سکھوں کی اس دعوت میں آ پہنچے تو حمید جہلمی نے دُور سے ہی ان کی جانب معنی خیز اشارہ کیا جس کا مطلب غالباً یہ تھا کہ وہی سوال ذرا ان سے بھی کرو مگر میں جانتا تھا کہ حمید جہلمی بہت مخلص آدمی ہے۔ وہ میرے اس انوکھے سوال پر چیں بر جبیں ہونے کے بجائے لطف اندوز ہوگا جب کہ ہمارے دوسرے "بیبٹی بند بھائی" اس کو اپنی انا کا مسئلہ بنا کر مجھ غریب کی ٹائیں ٹائیں "فش" کرنے کے لئے تیار ہو جائیں گے۔

حوالدار عبدالعزیز

لاہور کی صحافت، صحافی، اور مالکان و منتظمین جس شخص کو کبھی فراموش نہیں کر سکیں گے وہ حوالدار عبدالعزیز کی ذات تھی۔ صحت مند اور گٹھیلے جسم کا مالک عبدالعزیز جو کبھی حوالدار ہوا کرتا تھا۔ قیام پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد اخبارات کی فارورڈنگ کے کام میں مشغول ہو گیا۔ اخبارات کے بنڈل ملک کے دور دراز علاقوں میں پہنچانے کا سلسلہ محبوب کی زلف دراز سے بھی زیادہ طویل اور پُر پیچ ہوتا ہے۔ جس کا آغاز شام چھ سات بجے ہی ہو جاتا ہے اور اگلے دن اس وقت تک جاری رہتا ہے جب تک چھ سات بجنے کا چکر دوبارہ شروع نہیں ہو جاتا۔ دریں اثناء اخبارات کے دفاتر میں کئی شہروں سے بنڈلوں کے دیر سے پہنچنے یا بنڈل غائب ہونے کی اطلاعات موصول ہونے لگتی ہیں۔ اخبار کے مالک اور جنرل مینیجر آرام دہ کرسیوں پر بیٹھے سرکولیشن مینیجر کو یہ ہدایات جاری کر دیتے ہیں کہ فارورڈنگ ایجنٹ کے نام بنڈلوں کی قیمت ڈال دی جائے۔

زندگی بھر متواتر تین گھنٹے نیند نہ کرنے والا حوالدار عبدالعزیز اب آرام سے قبر میں سو رہا ہے اور اپنی نیند پوری کر رہا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیئے کسریں نکال رہا ہے۔ رات کے کسی بھی حصے میں اسے چیک کیا جاتا تو وہ پوری مستعدی سے فارورڈنگ میں جُتا ہوا ہوتا۔ نوائے وقت کے بنڈل اٹھاتے۔ امروز کے بنڈل

تیار کروا لیتے۔ پاکستان ٹائمز چلا گیا۔ مشرق میں گاڑی چلی گئی۔ بھاگ دوڑ۔ اِدھر جا اُدھر آ۔ ریلوے پر بکنگ شروع ہو گئی۔ باڑی پر بنڈل چلے گئے۔ چشم آہو پر جا رہے ہیں۔ جنرل بس سٹینڈ پر بس پر بنڈل لدوا دیتے۔ رات بھر جاگ کر کام کرکے یہ جیتا جاگتا چھلاوا یا جن جو چاہے اسے کہہ لو اخبارات کے دفتروں میں چکر لگا رہا ہے۔ جنرل مینجر کے پاس بیٹھا ہے۔ سرکولیشن والوں سے باتیں کر رہا ہے گلے شکوے شکایتیں ہو رہی ہیں۔ آج ڈیرہ غازی خاں بنڈل کیوں نہیں گیا ملتان کے بنڈل کہاں غائب ہو گئے۔ گجرات کے بنڈل جہلم کیوں چلے گئے گوجرانوالہ کے بنڈل واپس کیوں آ گئے۔ شیخوپورہ کل بھی بنڈل نہیں گئے تھے فیصل آباد والے بہت ناراض ہیں وغیرہ وغیرہ، حوالدار عبدالعزیز مٹی کے مادھو کی طرح بیٹھا صرف آنکھیں جھپکاتے جا رہا ہے جو غور سے دیکھنے کے بعد بھی بند ہی نظر آتی ہیں۔ اِن سب گلوں اور شکوؤں کا اس کے پاس بس یہی ایک جواب ہے یا زیادہ سے زیادہ مسکرا کر مجید صاحب، رانا صاحب، خورشید صاحب، میرے بل میں ڈال دیں۔

ایک بار اخبار فروش یونین کے جلسے میں راقم الحروف نے "نوائے وقت" کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ "اخبار فروشی کوئی جرم نہیں جرم تو ضمیر فروشی ہے۔" اس جملے پر حاضرین نے خوب داد دی۔ حوالدار اگلی لائن کے ایک کونے میں بیٹھا ہوا آنکھیں جھپکا رہا تھا صبح میں کسی کام سے مجید نظامی کے کمرے میں گیا تو وہاں وہ بیٹھا ہوا تھا کہنے لگا "مجید صاحب رات اس کی تقریر کا لطف آ گیا" بعد ازاں جب بھی میرے کمرے کے سامنے سے اس کا گزر ہوتا وہ مجھ سے ملے بغیر نہ جاتا

"سُنا بھئی ہُن تقریر کد کرنی ایں۔ مینوں ضرور دسیں

حوالدار نے اپنی بے پناہ محنت کے بل بوتے پر فارورڈنگ کے شعبے کو صحافت کے لئے ناگزیر بنا دیا اور اس شعبے کو اتنی ترقی دلی کہ تھوڑی سی مدت میں ہی اس نے اپنا باقاعدہ دفتر بنایا جس میں بہت بڑا عملہ کام کرنے لگا

زندگی کی آخری گھڑیوں تک جب اس کے ہونہار بیٹے جوان ہو کر اس کے کام کو عملاً سنبھال چکے تھے وہ پوری مستعدی اور بیداری کے ساتھ اپنے فرائض سرانجام دیتا رہا اور نیند سے بوجھل اور مخمور آنکھیں جھپکاتا رہا —

واہ رے حوالدار عبدالعزیز !!

خاموش فیچر

عبدالحمید چودھری "مکتبہ کارواں" کے سالارِ اعلےٰ ہیں۔ حسّاس اور جذباتی ہیں۔ کیونکہ بہت اچھے شاعر ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ مدّت گزری جن دنوں نوائے وقت اور "مکتبہ جدید" کے مابین کرائے کی بلڈنگ کا کچھ تنازعہ تھا۔ چودھری صاحب کو فریقین نے ثالث نامزد کیا تھا۔ مجھے "نوائے وقت" کی نمائندگی کرنے کے لئے ان کے پاس جانا پڑتا تھا اور مجھے ان کی حق گو طبیعت اور مزاج سے آشنائی ہوئی ان کا ادارہ خوب صورت لوگوں کے لئے خوب صورت کتابیں چھاپتا ہے کتابیں ہی نہیں وہ ہر چیز کو حسین نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور صرف خوبیوں پر نگاہ رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا کہ وہ اپنے اشاعتی وطباعتی ادارے پر ایک آدھ فیچر لکھنے کی اجازت مع ایک عدد اشتہار دے دیں۔ کچھ دیر انہوں نے بغور میرے چہرے اور گریبان میں جھانکا۔ چپکے سے لفافے میں کچھ بند کر کے میری جیب میں ڈال دیا اور کہنے لگے "یہ خاموش فیچر حاضر ہے" وہاں سے اُٹھنے کے بعد میں نے لفافہ چاک کیا تو اس میں سے دس دس کے چند "خاموش" نوٹ برآمد ہوتے میں نے انارکلی سے ہی بچے کے لئے دودھ کا ڈبہ لے لیا۔ گھر پہنچا تو وہ بھوک سے بلک رہا تھا۔ ڈبے کا دودھ اسے دیا گیا تو وہ فوراً خاموش ہو گیا ۔

خواجہ غلام علی لون

جب تک میں کھرولیاں (سیالکوٹ) میں رہا۔ ہماری "ڈاک" براستہ "بھوپال والا" آیا کرتی تھی۔ ایک کمزور سا بوڑھا ہاتھ میں برچھی لئے ڈاک کا تھیلا لئے روزانہ آیا جایا کرتا تھا۔ بارش ہو یا آندھی۔ کڑکڑتی دھوپ ہو یا اولے پڑ رہے ہوں "نالہ ایک" میں طغیانی ہو یا گھٹنے گھٹنے پانی ہو، یہ بابا ڈاک لاتا اور لے جاتا تھا۔ جب کہ ان دنوں "ایک" پر پُل وغیرہ کوئی نہ تھا۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ بھوپال والا کے لوگ اتنے محنتی کیوں ہیں۔

گجرات میں خواجہ غلام علی لون کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ بھوپال والا سے نقل مکانی کر کے یہاں آباد ہوئے ہیں تو مجھے وہ بابا یاد آیا اور یوں لون صاحب سے میرا غائبانہ تعلق قائم ہوا۔

لون صاحب دیکھنے میں منحنی ٹائپ کے انسان ہیں مگر بلا کے محنتی جب دیکھو کسی نہ کسی کام میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ان کے دفتر میں بے شمار احباب کا آنا جانا لگا رہتا ہے۔ مگر وہ حقّے کی نے منہ میں لئے کاغذوں پر" فائلوں میں کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں۔ جب فارغ ہوتے ہیں تو مسکراتے بھی ہیں اور ہنستے بھی ہیں۔ قہقہہ ان کے چہرے پر پھیل جاتا ہے۔ اس لئے اس کی آواز اتنی سنائی نہیں دیتی جتنا اس کا پھیلاؤ ہوتا ہے۔ کاروبار پر مصلحت کو فوقیت نہیں دیتے مگر جہاں معاملہ مقابلے کا ہو وہاں لنگر لنگوٹا کس کر میدان میں آکودتے ہیں۔ اس کا حساب کتاب بہت بعد میں کرتے ہیں۔ اور پھر کچھ کچھ سوچتے ہیں کہ اگر یہی رقم کاروبار پہ لگائی ہوتی تو کتنا منافع ہوتا۔

اولاد کے معاملے میں از حد خوش نصیب ہیں۔ ایک قابل اور ذہین بچے کی وفات کا صدمہ مومنانہ شان سے برداشت کرنے کا صلہ یہ ملا ہے کہ ان کے سبھی بچے بے حد محنتی، فرمانبردار اور کاروبار کو سمجھنے والے ہیں۔

خنُوث

میں ایک اخبار کے دفتر میں بیٹھا کام کر رہا تھا کہ ڈاکٹر نذیر احمد اپنے ہمراہ ایک باریش مہمان کو لیتے ہوئے آئے۔ ان کا یہ ساتھی اپنی وضع قطع اور شکل وصورت کی بناء پر ہر شخص کی توجہ کا مرکز بننے کا اہل تھا۔ چہرے پر کافی بڑی سفید رنگ کی ڈاڑھی، ٹخنوں تک اونچی پتلون، پاؤں میں بڑے بڑے فوجی بوٹ، اس کی آنکھوں پر سانپ کی آنکھوں کا گماں گزرتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ان سے ملیئے۔ یہ ہیں رشید احمد جالندھری۔ آج کل فرانس میں ہوتے ہیں۔ چند روز یہیں لاہور میں ہمارے ہی ہاں قیام کریں گے۔ خیر میں شام کو اپنی رہائش گاہ یعنی ڈاکٹر صاحب کے کمرے میں آیا تو یہ رشید احمد قریشی جالندھری ثم فرانسیسی وہاں موجود تھے۔ باتوں کا سلسلہ چل نکلا تو انھوں نے بتایا کہ وہ اسلام جیسے فطری مذہب کو ترک کر کے ان لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں جنھیں "قرآن" نے بھی ہدایت یافتہ قرار دیا ہے مزید تفصیل انہوں نے یہ بتائی کہ وہ "یہودی" ہو گئے ہیں۔ چنانچہ اسلام اور یہودیت کا ہم دونوں نے خوب خوب موازنہ کیا بالآخر وہ میرے دلائل کی تاب نہ لاتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ وہ پاکستان سے کوئی اخبار نکالنے کا منصوبہ لئے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر نذیر احمد بہت بھلے مانس، سادہ شریف، ملنسار اور دوست نواز انسان ہیں انہیں رشید احمد قریشی نے اپنے منصوبے کی جو تفصیلات بتائیں وہ بے حد مسحور کن تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ کاغذ کا ایک جہاز فرانس سے ان کے کہنے پر چل پڑا ہے ایک دوسرے جہاز میں آفسٹ پریس کی مکمل مشینری آ رہی ہے اور یہ کہ انہیں اس سلسلہ میں ماہرین طباعت واشاعت کی بے حد ضرورت ہے۔

وہ کسی کام سے اِدھر اُدھر ہوئے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ یہ کس کو وہ ساتھ لے آئے ہیں۔ اس پر وہ کہنے لگے کہ مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ شخص کون ہے اور کیا ہے؟ میں تو صرف یہ جانتا ہوں کہ مہمان نوازی کا ہمیں حکم دیا گیا ہے

اور خود رسول اللہ نے یہودیوں کی اس وقت تک بے حد خدمت کی تھی جب تک وہ حد سے نہیں بڑھ گئے تھے۔ ان کی بات چونکہ معقول اور اسلامی تعلیمات کے مطابق تھی۔ لہذا مجھے تسلیم کرنا پڑا۔ رشید احمد قریشی سے بعد ازاں یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے مختلف ادوار میں مختلف ناموں سے پاسپورٹ بنوائے اور بیرونی ممالک کے سفر کئے اس کی باتوں میں اتنا تضاد اور غلط بیانیاں تھیں کہ میں چکرا کر رہ گیا۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا کہ یہ شخص ناقابلِ اعتماد ہے۔ جس سے وہ محتاط ہو گئے۔ میں نے یہ بھی نوٹ کیا کہ وہ اپنا بیگ کسی بھی حال میں اپنے سے جدا نہیں کرتا یہاں تک کہ غسل خانے میں بھی ساتھ لے جاتا ہے۔ باتوں باتوں میں ایک روز اس نے بتایا کہ مصر اور اسرائیل میں صلح ہو جائے گی۔ شاہ ایران کو تاج و تخت سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ تیسری عالمگیر جنگ کے بارے میں بھی اس نے بعض ایسی باتوں کی نشان دہی کی جس کے آثار آج نظر آ رہے ہیں۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ یہ باتیں کیوں کر اتنے اعتماد سے بیان کر رہا ہے۔ اس پر اس نے اپنے بیگ سے بائبل نکالی اور اس میں سے بعض پیشگوئیوں کو عبرانی میں پڑھ کر ان کا ترجمہ سنایا۔ میں نے اس عجیب و غریب وضع قطع کے حامل مہمان کا نام اسطو خدوس رکھ دیا۔ مگر بعد ازاں اس نے کئی قسم کے حیلوں بہانوں سے ڈاکٹر صاحب اور مجھ سے کچھ رقم مانگی اور ہم نے یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ غلط بیانی سے کام لے رہا ہے۔ اس کی مطلوبہ رقم اسے مہیا کر دی تو ڈاکٹر صاحب نے اس کا نام اسطو خبوث، جو اس کے کارناموں کے لحاظ سے زیادہ مناسب تھا۔ تجویز کر دیا۔ ایک روز وہ کہنے لگا کہ میں کاغذ کا جہاز اور پریس کی مشینری کے لئے جا رہا ہوں۔ مجھے کراچی کا کرایہ دے دو۔ چنانچہ ہم نے اُسے یہ کرایہ دے دیا اور یوں جالندھر کے ایک امام مسجد کا بیٹا جو کبھی مسلمان تھا مگر اب "بیک ٹو دی پویلین" ہو کر یہودی بن گیا تھا اور ہمارے سر پہ بلا کی طرح نازل ہو گیا تھا۔ کراچی سے کاغذ کا جہاز اور پریس کی مشینری وصول کرنے چلا گیا اور خدا کا شکر ہے کہ پھر آج تک لوٹ کر نہیں آیا۔

ڈاکٹر صدیق احمد

بی بی پاکدامن میں ڈاکٹر صدیق احمد کا کلینک ہے جہاں وہ اور اُنکے بھائی شریف احمد مریضوں کے دُکھ درد کا مداوا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صدیق احمد ان معالجین میں سے ہیں جنہیں اللہ تعالےٰ نے فطرتاً رحمدل، حساس اور غریب پرور بنایا ہے۔ طمع اور لالچ سے وُہ اس طرح پرہیز کرتے ہیں جیسے کھانسی کے مریضوں کو کھٹی چیزیں کھانے سے پرہیز بتایا جاتا ہے۔

مریضوں سے انتہائی ہمدردی سے پیش آنا۔ ان کی نصف بیماری کے خاتمے کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے زیر علاج مریض بہت جلد شفایاب ہو جاتے ہیں۔ نفسا نفسی کے ایسے دور میں جب ڈاکٹروں کے رویے سے لوگوں کو متعدد جائز شکایات ہیں۔ ڈاکٹر صدیق احمد جیسے اعلےٰ تعلیم یافتہ اور تجربہ کار معالج کا نام سونے کے حرُوف کندہ کرنے کے لائق ہے ۔

ڈاکٹر کرنل عطاء اللہ

"دو دنیاؤں کا شہری" کے عنوان سے معلوماتی اور مہم جوئی کی داستان پر مشتمل کتاب، بزبان انگریزی تحریر کرنے والے ڈاکٹر کرنل عطاء اللہ کے ٹو اور ہمالیہ کی بلند ترین چوٹیوں سے بھی کہیں بلند اخلاق کے حامل تھے۔ اِن کی نجی زندگی ایک ایسے مومن کی زندگی تھی۔ جسے حسناتِ دنیا اور حسناتِ آخروی دونوں سے وافر حصہ ملا تھا۔ گفتگو میں متانت، کاروبار میں سلیقہ، ماتحتوں سے حسنِ سلوک، ساتھیوں سے مروت، بزرگوں کا ادب، چھوٹوں سے پیار، ازدواجی زندگی میں عمدہ نمونہ، زندہ تھے تو دلوں کی دھڑکن تھے۔ خالقِ حقیقی سے جا ملے تو آہوں کا نذرانہ وصول کرتے ہیں۔ دوستوں، بزرگوں، ساتھیوں اور ماتحتوں کی شبینہ دعاؤں کی تکمیل اس وقت تک ممکن ہی نہیں جب تک ڈاکٹر صاحب کی یادیں آنکھوں میں آنسو نہ لرزنے لگیں۔

ڈاکٹر محمد احمد فاروقی

ڈاکٹر محمد احمد فاروقی کے بارے میں آج تک میں یہ تمیز نہیں کر سکا کہ وہ معالج بہتر ہے یا مقرر۔ مضمون نگار اچھا ہے یا فلسفی۔ دوست بہتر ہے یا دشمن۔ ہر ایک سے محبت سے پیش آتے ہیں۔ بات نہایت جچی تلی اور "ٹو دی پوائنٹ"۔ تقریر نہایت مدلل، تحریر دل پذیر، چائے پلانے پر آجائیں تو پیالوں پر پیالے کھنکتے ہیں۔ مچھلی پکڑنے کا خبط بھی سال میں ایک بار ضرور سر پہ سوار ہوتا ہے اور تین چار ماہ تک رہتا ہے۔ خرگوش، مرغابی اور اسی قبیل کے جانوروں اور پرندوں کے شکار کے بھی بے حد شوقین ہیں۔ دلیل اس کی یہ دی جاتی ہے کہ قرآن حکیم میں کسی کھیل تماشے اور تفریح کا کہیں کوئی تذکرہ نہیں مگر صَیدُ البَرِّ وَالبَحرِ کا ذکر موجود ہے کئی قسم کے جانور اور پرندے پالنے کا بھی ڈاکٹر صاحب کو بے حد شوق ہے علاوہ ازیں گھر میں پھلدار اور پھولدار پودے لگانے اور ان کی بہار دیکھنا بھی ان کے مشاغل میں شامل ہے مریضوں سے فیس برائے نام لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جوان بچیوں اور بچوں کے اخراجات کو پورا کرنے کے لئے انہیں راتوں کو اُٹھ اُٹھ کر دعائیں کرنی پڑتی ہیں ۔

ڈاکٹر نذیر احمد

ڈاکٹر صاحب کا بچپن افغانستان میں گزرا۔ جہاں ان کے والد ڈاکٹر سید رشید الدین بہت مشہور معالج تھے جب کہ ان کا آبائی وطن امرتسر ہے۔ اعلیٰ تعلیم انہوں نے پشاور میں اور کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں فارسی، پشتو اور میڈیسن سے بھی لگاؤ ہے۔ طبیعت میں بے نیازی کا عنصر غالب ہے سخت سے سخت حالات کا مقابلہ پامردی اور بہادری سے کرنا خوب جانتے ہیں۔ کھانے میں جتنا مل جائے اور جس وقت مل جائے محض ایک ہی نشست کے لئے کافی ہوتا ہے نہ ملے تو ہفتوں بلکہ مہینوں صرف نمکین قہوے پر ہی اکتفا کر جاتے ہیں جب سے میرا ان سے رشتۂ اخوت استوار ہوا ہے میں حتی الامکان ان کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہوں مگر وہ آناً فاناً یکبارگی سارے کئے کرائے پر پانی پھیر دیتے ایک روز پراپرٹی ڈیلنگ میں چند ہزار روپے کی آمدنی انہیں ہوتی۔ آتے ہی گھٹ سے ایک ہزار روپے کی رقم میری جیب میں ٹھونس دی۔ عید کا موقع تھا اور سچ بات یہ کہ میں بے حد پریشان تھا کہ عید کیوں کر گزرے گی؟

میں نے ان کی عمر کے بارے میں کبھی سوال نہیں کیا لیکن ان کی کنپٹیوں کے طویل و عریض چاندی جیسے بالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ پچاس پچپن سے کسی طرح کم نہ ہوگی اس عمر میں بھی لکشمی مینشن (بالمقابل ریگل) سے گلبرگ،

ماڈل ٹاؤن، گارڈن ٹاؤن اور اسی قدر دوری پر واقع دوسری آبادیوں کا پاپیادہ چکر لگانا ان کا معمول ہے۔ ہنس مکھ اور صاف گو ہیں بیگانوں سے خنجر کے وار کھا کر انہیں بخوشی معاف کر دیتے ہیں مگر اپنوں سے پھول بھی انہیں بار ی

زخم دے جاتے ہیں۔ روزانہ تین روزنامے، دو اُردو اور ایک انگریزی کا خرید کرتے ہیں پراپرٹی کے رجسٹر اور بہی کھاتوں کی چار رنگوں کی روشنائی سے خانہ پری کرتے ہیں۔ لاہور کی تمام منقولہ وغیر منقولہ جائیداد جس کی پاکستان بننے کے بعد خرید و فروخت ہوئی۔ ان کے ان کھاتوں میں درج ہے۔ کب اور کس سن میں کسی کو پلاٹ، مکان، کوٹھی کی ضرورت تھی، ضرورت ہے یا ضرورت ہو گی یہ سب کچھ ان کی کتابوں میں چڑھا ہوا مل جائے گا۔ ٹیلیفون کے ٹوکنوں کے کبھی ناغہ نہ کرنے والے گاہکوں کے سرخیل ہیں اور اس سلسلے میں حکومت کے غالباً سب سے بڑے گاہک ہیں۔ پراپرٹی کے خواہشمند حضرات کو فون کرنا۔ انہیں جگہیں دکھانا اور ان کے لئے جملہ معلومات اور آسانیاں بہم پہنچانا ان کا اخلاقی مشغلہ ہے اس طویل دردِ سر کے بعد جو کچھ کماتے ہیں۔ دوستوں کا حصہ نکالنے کے بعد وہ اخبار والے کو دے دیتے ہیں۔ یا تین چار روز اتنا کھاتے ہیں کہ مہینوں اور سالوں تک کچھ کھانے کی حاجت نہیں رہتی ☆

ڈے اینڈ نائٹ

لکشمی چوک سے آگے بیڈن روڈ کو جانے والی سڑک کے کونے پر نگاہ دوڑائی جائے تو "اسرار پبلی کیشنز" سے چند گز کے فاصلے پر ایک کیبن بنا ہوا تھا جس پر "ڈے اینڈ نائٹ بک سٹال" لکھا ہوتا تھا۔ اب یہ کیبن کئی روز سے غائب ہے مگر اس کا مکین ریاض وہیں تھڑے پر کتابیں اور رسالے بیچتا ہے۔ اس ریاض میں مقاماتِ حریری کے ہیرو حارث بن ہمام کی روح حلول کر آئی ہے اگر آپ اسے میواتی زبان بولتے ہوئے دیکھیں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ پنجاب کا رہنے والا ہے۔ آزاد کشمیر کا باشندہ اس کی کشمیری سن کر یہ باور کرنے کو تیار نہیں ہوگا کہ وہ کبھی آزاد کشمیر گیا ہی نہیں۔ ملتانی بولی وہ یوں بولتا ہے کہ کہیں بھی اس کا لب و لہجہ یہ چغلی نہیں کھاتا کہ اس کا تعلق ملتان سے نہیں ہے۔ غرضیکہ عجیب و غریب آدمی ہے رُوپ بہروپ کا بادشاہ ہے۔ دوسروں کی جیب سے پیسے نکلوانے کا ماہر ہے قرض لے لینا اپنا حق اور اسے واپس کرنا عظیم نادانی تصور کرتا ہے، بے حد لذیذ اور مسالے دار باتیں کر کے مسرّت کے سامان بہم پہنچانا اس کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بائیں ٹانگ ذرا دبا کر چلتا ہے ٭

راجہ طارق محمود

گجرات میں جن دوستوں سے اولین تعارف ہُوا ان میں راجہ طارق محمود شامل نہ تھا بلکہ "تبع تابعین" میں اس کا شمار ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ "دھنک" میں معززین گجرات کی جو تصویریں شائع ہوئیں۔ اِن میں راجہ طارق نہیں ہے لیکن یہ عجیب بات ہے کہ راجہ طارق سے دوستی ہوئی تو سب کو مات کر گئی۔ بھائیوں سے بھی زیادہ تعلق قائم ہُوا اور تب سے آج تک اس میں کسی قسم کا کوئی رخنہ نہیں آیا۔ مسلسل کئی ماہ تک میرے نان و نفقہ کی ذمہ داری کا بوجھ اس نے جس عالی حوصلگی سے اٹھایا اس کی مثال اِس دورِ نفسانفسی میں مِلنا ناممکن ہے۔ جہاں مجھے جانا ہوتا ہے راجہ طارق میرے ساتھ ہوتا ہے کبھی اس نے وقت نہ ہونے کا بہانہ نہیں کیا۔ کسی مالی منفعت یا دنیوی لالچ کا تذکرہ نہیں کیا۔ رات کو اکیلے میں اسے نیند نہیں آتی۔ بتی جلا کر سوتا ہے جب کہ مجھے اس سے خاصی کوفت ہوتی ہے میں آدھی رات کے بعد گھور اندھیرے کو پسند کرتا ہوں تاکہ صبح جب چڑیاں چوُں چوں کرنے لگیں اور اجالے کی پریاں اپنا جوبن دکھائیں تو حواس خمسہ اِن سے لطف اندوز ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ راجہ طارق جب سو جاتا تو میں چپکے سے بلب کو "آف" کر دیتا اس کی ایک خوبی یہ ہے کہ جب اسے نیند آ جائے پھر صوُرِ قیامت بھی اسے جگانے پر قادر نہیں ہوتا رات کو ہمیشہ اس فکر میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح دو بج جائیں صبح نو بجے ہزار کوششوں سے جب اسے اٹھایا جاتا ہے تو پوچھتا ہے کیا اذان ہو گئی ؟ ہاں اب ایک تبدیلی ضرور آئی ہے کہ شام کو چار بجے بیڈمنٹن کھیلنا نہیں بھُولتا تمام تعلق ریکٹ کی جھولی میں ڈال کر کھیل کے میدان میں جا پہنچتا ہے۔ میں کئی روز تک سوچتا رہا کہ آخر اس کی کیا وجہ ہے آخر عقدہ یوں کھُلا کہ کھیل کے نام میں "بیڈ" کا لفظ

ہے۔ دو بجے کے بعد "بیڈ" سے بڑھ کر کوئی چیز اسے عزیز نہیں۔

بھول جانے کے سلسلے میں بھی وہ قابلِ ذکر مقام کا حامل ہے دس بجے صبح کے کرنے والے کام اکثر رات کو دس بجے اسے یاد آتے ہیں اور وہ اپنی اس عادت کو خوب بُرا بھلا کہتے ہوئے سب کچھ بھول جاتا ہے۔ گھر والے اس کا کھانا رکھ رکھ کر تنگ آ گئے ہیں کیونکہ وہ کھانا ہمیشہ میرے جیسے بے گھر دوستوں کے ساتھ کھاتا ہے جن کا بل دیتے ہوئے اسے بے حد مسّرت ہوتی ہے۔ جب کبھی جیب خالی ہوتی ہے تو میرے ساتھ فاقہ بھی ہنسی خوشی نگل جاتا ہے فلموں کا بہت شوقین ہے اور ہمیشہ آخری شو دیکھتا ہے جس کی اصل وجہ وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی ہے کہ رات کے دو بجانے ہوتے ہیں کبھی اگر پہلا یا دوسرا شو کسی مجبوری کے تحت دیکھ بھی لے تو اس کی کوفت دور کرنے کے لئے آخری شو ضرور دیکھنے کی کوشش کرتا ہے اپنا دایاں ہاتھ اکثر مصروف رکھا کرتا ہے تاآنکہ نیازی صاحب نے اتنی بار ٹوکا کہ اب وہ اپنا یہ ہاتھ جسم کے زیریں حصے کی جانب لے جانے کے بجائے کندھے سے بلند رکھتا ہے جس پر اکثر دیکھنے والے پوچھتے ہیں کہ راجہ صاحب سے یہ کیا کر رہے ہیں؟

اردو گرامر میں خاصہ کمزور ہے۔ تانیث کو بھی تذکیر بنا دیتا ہے اور تثنیہ کے بجائے واحد استعمال کرتا ہے جب چلتا ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بحری بیڑا دائیں سے بائیں ہلکورے کھا رہا ہے "ہر شام" فون پر اخبار کے دفتر میں کسی نیوز ایڈیٹر کو جب خبریں لکھواتا ہے تو شکیل احمد کی رُوح اس میں حلُول کر جاتی ہے اس نے ڈسپنسر کا باقاعدہ کورس کیا ہوا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زخم کہیں بھی ہوں ان کو دامے درمے، سخنے بھرنے کی حتی المقدور سعی کرتا ہے ؎

رانا خداداد خاں

پنجاب کے زمینداروں اور صنعت کاروں میں رانا خداداد خاں کو ممتاز اور منفرد حیثیت حاصل ہے۔ رانا صاحب کبھی کروڑوں میں کھیلتے تھے مگر اب جب کہ ان کی فرم قومی تحویل میں آجانے کے بعد ان کی ملکیت اور کنٹرول سے عارضی طور پر یا مستقلاً" نکل چکی ہے کھیلتے تو اسی طرح ہیں اور دوستوں کو کھلاتے بھی اسی طرح ہیں۔ فرق صرف یہ نظر آتا ہے کہ اب ان کی رسائی کروڑوں سے ہٹ کر سینکڑوں تک محدود ہو گئی ہے مگر چونکہ دِل گُردہ ان کا بڑا ہے اور ان کے اخلاص و احباب کا دائرہ پہلے سے بھی وسیع ہو گیا ہے اس لئے اپنے آپ پر وارد ہونے والے اس "مانیٹری" انقلاب کا کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کا دسترخوان جسے بڑے لوگوں کی زبان میں "ڈائیننگ ہال" کہنا پڑے گا، بہت کشادہ ہے۔ جہاں آج بھی رانا صاحب احباب کے جلو میں ماحضر تناول کرتے ہیں۔ ان کی اپنی خوراک بہت سادہ اور معمولی ہوتی ہے۔ البتہ کچن میں جہاں کبھی کھانے پینے کی چیزوں کی فروانی "بغیر حساب" ہوتی تھی اب وہاں جو کچھ منگوایا جاتا ہے سوچ سمجھ کر لایا جاتا ہے۔ رانا صاحب دوستوں اور مخلصین کے اتنے شیدائی اور فدائی ہیں کہ اگر ان سے کسی نے کوئی "بیر" لینا ہو اور اس کے احاطۂ قدرت میں ہو تو بس ان کے احباب کا داخلہ ان کی کوٹھی میں بند کر کے اپنا انتقام لے سکتا ہے۔ ایسی حالت میں وہ بمشکل چند گھڑیاں ہی زندہ رہ کر گزارہ سکتے ہیں۔ ان کی وسیع کوٹھی کے تقریباً ہر کمرے میں ان کی مرحومہ رفیقۂ حیات کی

بڑی بڑی تصویریں آویزاں ہیں جو اس امر کی غماز ہیں کہ بچھڑنے والا ساتھی گو نظروں سے اوجھل ہے مگر دل و دماغ پر پوری طرح چھایا ہوا ہے۔ ایک قدآدم تصویر ان کے والد ماجد کی بھی وہاں نظر آتی ہے جو رئیسانہ ٹھاٹھ باٹھ، بزرگوں کے روائتی بارُعب اور پُروقار لباس اور مشرقی تہذیب و تمدّن کا واجب الاحترام شاہکار ہے۔

رانا صاحب جب مسکراتے ہیں اور جب کیا، وہ اکثر مسکراتے ہی رہتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا مونا لیزا جاتے جاتے اپنی مسکراہٹوں کا سارا ورثہ ان کے سپرد کر گئی ہے۔ کبھی اگر بھُولے سے یا یہ یاد کر کے کہ وہ اصلاً نسلاً راجپوت ہیں۔ غُصّے میں آبھی جاتیں تو ان کی مسکرانے کی یہ عادت ان کا سارا غصیلا مُوڈ برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ امسال حج کی سعادت انہیں بیٹھے بٹھائے نصیب ہوئی تو اتنے خوش و خرّم دکھائی دے رہے تھے گویا زندگی کی سب سے بڑی آرزو پوری ہو گئی۔۔ دیارِ حبیبؐ کا دیدار کرنے کے تصوّر نے ہی انہیں جذب و کیف کے بحرِ بے کنار سے ہم کنار کر دیا۔ ایسے عاشقِ رسولؐ کی کیفیت ان گلیوں میں پہنچ کر کیا نہ ہوئی ہوگی!!

ان کی خوب صُورت کوٹھی کے سادہ مگر دیدہ زیب کمروں میں قیمتی فرنیچر سے کئی گنا کتابیں ہی کتابیں نظر آتی ہیں جو علم و ادب کے ہر شعبہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ قرآن کریم کی تفسیر کی کئی جلدیں بھی یہاں عام کتابوں سے کسی قدر بلند نہایت سلیقے سے رکھی ہوئی ملتی ہیں۔ تقریر بھی وہ اچھی کر لیتے ہیں لیکن جہاں سامعین کے جذبات کو انگیخت کرنے اور ان کو نعروں پر آمادہ کرنے کا سنہری موقعہ آتا ہے اس مرحلے پر وہ الفاظ کو چبا چبا کر مزید آہستہ آواز میں ادا کرنے لگ جاتے ہیں اور یوں سامعین پر اپنا مافی الضمیر ہر طرح واضح کر دینے اور ان کی سو فی صد ہمدردیاں حاصل کر لینے کے باوجود ان کی تقریر کے دوران نعروں میں وہ گُونج پیدا نہیں ہوتی جو محض الفاظ کا جذباتی تانا بانا بُننے والے پیشہ ور مقرّروں کا خاصّہ ہے، بہ ایں ہمہ رانا خداداد خاں اس گئے گزرے دور میں مشرقیّت کی پُرخلوص قدروں کا ایسا نمائندہ ہے جس کی دوستی اور تعلقِ خاطر پر بلا شبہ فخر کیا جا سکتا ہے۔

ان کے گیراج میں ایک گاڑی مُدّت سے کھڑی میں نے دیکھی ہے جو ایک انچ بھی اِدھر اُدھر نہیں ہوتی جب کہ دن میں بے شمار گاڑیاں کوٹھی کے پختہ صحن میں آتی جاتی رہتی ہیں اس گاڑی کے اس طویل قیام کی کوئی خاص وجہ مجھے نظر نہیں آئی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ اس بے چاری کے کوائف دریافت کروں گا۔ مگر جب رانا صاحب لمبا سا کوٹ پہنے دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈالے باہر آتے ہیں یا میں خود ہی دندناتا ہوا ان کے تمام کمروں میں گھوم پھر کر انہیں تلاش کر لیتا ہوں اور وہ اپنی ناقابلِ فراموش مسکراہٹوں کے پے دَر پے وار کرنے لگ جاتے ہیں تو میں یہ سب کچھ بھول جاتا ہوں رانا صاحب محفل کو سجانے اور اسے کشت و زعفران بنانے میں بھی ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ لاہور سے کراچی کا طویل سفر کرنے والے مسافر حضرات اگر اپنے ہمراہ انہیں لے جا سکیں تو اس سفر کی طوالت اور بوریت شرطیہ طور پر ختم ہو جائیگی ؂

رُخسانہ

کراچی صدر میں ایک صاحب ہُوا کرتے تھے۔ نام خُدا جانے کیا تھا مگر سب انہیں مُنّاجی کہا کرتے تھے۔ مُناجی نے ایک ورکشاپ کھول رکھی تھی اور ان کا خاصہ کاروبار تھا۔ ان کی شادی کی ضیافت میں مَیں بھی شریک تھا جس میں انہوں نے دل کھول کر خرچ کیا تھا۔ میں ابھی کراچی ہی میں تھا کہ ان کے ہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس موقع پر بھی انہوں نے خوشی کا اظہار کرنے کے لئے جن دوستوں کو مدعو کیا۔ ان میں مَیں بھی شامل تھا۔ بعدازاں میں لاہور آ گیا۔ دُوسری بار کراچی گیا تو مُناجی کی بیٹی رُخسانہ آٹھ دس برس کی تھی۔ اور بہت لاڈلی تھی کہ اکلوتی تھی۔ کراچی کے تیسرے سفر میں نہ مُناجی کا کوئی پتہ چلا نہ ان کی ورکشاپ کا۔ مجھے ٹاور میں واقع ایک دفتر میں کچھ کام تھا۔ وہاں ایک ٹائپسٹ لڑکی کو دیکھ کر میں ٹھٹکا۔ کیونکہ اس کی صُورت جانی پہچانی سی نظر آئی۔ اس نے مجھے دیکھا تو بھاگ کر آئی اور "چاچا" کہہ کر، حاضرین کو نظر انداز کرتے ہوئے مجھ سے لپٹ گئی اور اس کی بڑی بڑی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو بہنے لگے۔ میں اسے پہچان چکا تھا وہ رُخسانہ تھی۔ پتہ چلا کہ مُناجی انہیں بے سہارا چھوڑ کر انتقال کر چکے ہیں۔ جو کچھ روپیہ جمع تھا۔ اس سے رخسانہ نے بمشکل اپنی تعلیم مکمل کی۔ دریں اثناء اس کی ماں بھی مر گئی اور یوں اسے اپنے کسی قریبی عزیز کے ہاں پناہ لینی پڑی۔ مگر وہاں مالی حالات اچھے نہ تھے۔ اور تب اسے سروس کرنی پڑی۔ اس نے لڑکیوں کی سروس کے بارے میں جو ذاتی مشاہدات

بیان کئے۔ انہوں نے مجھے بے حد غمزدہ کیا۔ انہی دنوں لاہور کے ایک ہفتہ وار میں "ایک کلرک لڑکی" کے عنوان سے ایک نظم شائع ہوئی تھی۔ اس کی ایک کاپی میں نے رُخسانہ کو دی۔ کیونکہ اتفاق سے نظم میں رُخسانہ ہی کا تذکرہ تھا۔ وہ نظم یہ تھی

اے حسیں رخسانہ! اِک افسانہ ہے تیرا شباب
خوں کے بدلے دوڑتی ہے تیری نبضوں میں شراب
تو نگارِ کیف و مستی، تو محبت کی کتاب
اک چلتا پھرتا جادو، ایک لہراتا سا خواب

فطرتِ ہستی کا ہے تو ایک رنگیں شاہکار
دیکھتے ہی تجھ کو آ جاتا ہے بے وجہ قرار

مسکراتی جھومتی دفتر میں جب آتی ہے تو
اک ادائے ناز سے زلفوں کو لہراتی ہے تو
ڈوبتی نبضوں میں برقِ عشق دوڑاتی ہے تو
کیا بتاؤں میں تجھے کیا چیز بن جاتی ہے تو

دھڑکنیں بیدار ہوتی ہیں تری رفتار پر
بجلیاں سی کوند جاتی ہیں دلِ بیمار پر

جب تبسم رقص کرتا ہے لبِ اعجاز پر
تیرتا ہے ایک نغمہ گنگناتے ساز پر
کتنے دیوانے لپکتے ہیں تری آواز پر
جیسے کوئی چونک اُٹھتا ہو پرانے راز پر

سینکڑوں فتنوں کو دیتی ہے جنم تیری ہنسی
کتنا پُر امید ہو جاتا ہے ہر اک آدمی

جب کبھی چہرے پہ ہوتی ہے اُداسی کی جھلک
جاگ اُٹھتی ہے کئی سینوں میں وحشت کی دھمک
دل دھڑک اُٹھتے ہیں آ جاتی ہے آنکھوں میں چمک
تیری ہمدردی کی ہر پہلو میں اُٹھتی ہے کسک

دوستی کا ہر کوئی تجھ کو دلاتا ہے یقیں
مرکزِ اُمید ہوتی ہے تری شکلِ حسیں

سوچنے کی ہے کسی کو اس قدر فرصت کہاں
تجھ کو لے آئیں یہاں پر کون سی مجبوریاں
تو سُنا سکتی نہیں ہر اک کو اپنی داستاں
دردِ تیرا بن کے ہے قلبِ شاعر پر عیاں

تو حقیقت ہے غمِ ہستی کی، افسانا نہیں
تیرے دل کا غم کسی نے آج تک جانا نہیں

یہ ترا حسنِ جہاں آرا و سراپا نور ہے
تو حسینہ ہے، کلرکی پر مگر مجبور ہے
جس پہ ٹوٹی برقِ عالم سوز تو وہ طور ہے
تو بھی اس دُنیا میں میری ہی طرح رنجور ہے

کاش تیرے دردِ پنہاں کو زمانہ دیکھ لے
بجلیوں کی زد میں تیرا آشیانہ دیکھ لے

کراچی میں اپنے قیام کے دوران میں نے اس کے لئے مناسب رِشتہ تلاش کرنے کے لئے زبردست دوڑ دھوپ کی اور خدا کا شکر ہے کہ میری کوششیں کامیاب ہوئیں اور یوں مرجھائی ہوئی اس کلی پر پھر سے بہاروں نے اپنا دامن وا کیا اور اب وہ مشرقِ وسطےٰ میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ پُرسکون زندگی بسر کر رہی ہے۔

رشتہ و پیوند

میں تو "خ" صاحب کو ہمیشہ اپنا قریبی عزیز اور رشتے میں اپنا بھائی ہی سمجھتا رہا کیونکہ ان کی والدہ میری خالہ بھی لگتی ہیں اور پھوپھی بھی۔ میری امّی اور ابا کی وہ بالترتیب تایازاد اور ماموں زاد ہمشیر ہیں۔ پھر "خ" صاحب کی شادی بھی اپنے حقیقی ماموں جو میرے بھی ماموں اور تایا لگتے تھے کی بیٹی سے ہوئی تھی۔ یہ "خ" صاحب بہت محنتی اور ذہین تھے۔ انہوں نے میٹرک پاس کیا اور پھر "وایا بھٹنڈہ" یعنی کوئی فاضل کرنے کے بعد بی اے کیا۔ پھر بنکنگ کی تعلیم حاصل کی اور اپنی محنت و دیانت کے بل بوتے پر ایک بہت بڑے اور اہم بینک میں کلیدی اسامی تک ترقی پائی۔ ان کی بیوی یعنی ہمارے ماموں کی بیٹی ایک خورد سال بچے کو چھوڑ کر انتقال کر گئیں تو "خ" کی دوسری شادی خاندان اور رشتے داروں سے باہر ہوگئی۔ ایک روز میں ان کے ہمراہ ان کے نئے خسر سے ملنے کے لئے گیا۔ انہوں نے میرے بارے میں "خ" سے پوچھا کہ اس کا آپ سے کیا رشتہ ہے۔ "خ" کہنے لگے یہ میری امّی کی پھوپھی کا پوتا ہے۔ اس رشتے کا سننا تھا کہ میں چُپ نہ رہ سکا۔ میں نے کہا جناب انہوں نے ذرا تکلف سے کام لیا ہے۔ ورنہ یہ" اس سے بھی اختصار سے کام لے سکتے تھے۔ اس پر وہ حیرت سے پوچھنے لگے۔ وہ کیسے؟ میں نے کہا مثلاً" یہ کہ جس آدم کی اولاد ہیں وہ میرا بھی دادا پڑ دادا تھا۔ یہ سُن کر وہ بزرگ بہت ہنسے۔ بات آئی گئی ہوگئی۔ ایک صاحب کو کسی نے بتایا کہ "خ" سے میری کوئی رشتہ داری ہے۔ انہیں ان سے یا بینک سے

کوئی کام تھا۔ وہ میرے پاس آئے اور کہنے لگا کہ کیا "خ" سے آپ کا کوئی رشتہ و پیوند ہے ! میں نے کہا بھائی وہ بڑے آدمی ہیں۔ میں حقیر فقیر پُر تقصیر۔ بھلا میرا ان سے کیا پیوند ہو سکتا ہے ! کہنے لگا پھر بھی کچھ تو ہوگا۔ میں نے کہا بقول ان کے میں ان کی والدہ کی پھوپھی اماں کا پوتا ہوں۔ وہ یہ سُن کر کچھ چکرائے تو میں نے جیومیٹری کا ایک اور مسئلہ پیش کر دیا کہ "خ" صاحب میری حقیقی پھوپھی کے بیٹے کی حقیقی پھوپھی کے بیٹے ہیں۔ وہ ابھی اپنی بھول بھلیوں ہی میں تھے کہ میں نے بتایا کہ ان کی پہلی بیوی کے والد میرے ابا کے ماموں زاد اور میری امی کے تایا زاد بھائی تھے۔ سفارش کے خواہشمند وہ صاحب جھٹ سے یہ کہتے ہوئے اُٹھ کھڑے ہوئے "بس بس اتنا ہی کافی ہے"

بات چل نکلی رشتوں کی تو یہ تذکرہ بھی ہو جائے کہ کراچی میں سرکلر ریلوے کا اجراء تو قیام پاکستان کے بہت بعد میں کہیں جا کے ہوا۔ مگر ہمارے ہاں رشتوں کی ایک سرکلر ریلوے طویل مُدّت سے چل رہی تھی۔ مگر اس کے "انکشاف" اور "دریافت" کا سہرا میرے سر بندھا۔ جب ایک روز میں نے خاندان کے تقریباً سبھی بڑوں اور چھوٹوں کے رُوبرو بتایا کہ ہمارے ہاں رشتہ کی ایک گول ریلوے ہے۔ جس کے چار بڑے سٹیشن ہیں تو سبھی محوِ حیرت ہو گئے۔ اس مرحلے پر میں نے ایک اور شوشہ چھوڑا کہ ہماری ممانی کو مرکز بنا کر اگر اس گول چکر کو دیکھا جائے تو وہ اپنی بھابی کی بھاوج کی بھابی ہیں۔ کسی کی سمجھ میں یہ پہیلی نہ آئی تو اس تھیوری کو سچ ثابت کرنے پر ایک سو روپے انعام مقرر کر دیا گیا۔ چنانچہ میں تفصیلات بیان کرنے لگا۔ سب قلم کاغذ سنبھال کر بیٹھ گئے۔ میں نے کہا ہماری ممانی "ص" کی سگی بھاوج "ن" ہے۔ "ن" کی سگی بھابی "م" ہے۔ "م" کی بھاوج بلکہ دو بھابیاں ہماری حقیقی خالائیں "م" ہیں۔ م کی بھابی پھر ہماری ممانی یعنی "ص" ہی ہیں۔ اسی طرح ان میں سے کسی کو بھی مرکز بنایا جائے تو اس گول چکر کا اختتام اسی کی ذات پر ہوگا۔ گزشتہ دنوں ہماری یہ ممانی جو ہمارے بڑے دادا کی بیٹی تھیں انتقال کر گئیں اور تعزیت کے لئے آنے والے احباب نے جب یہ پوچھا کہ یہ کل

کتنے بہن بھائی ہیں تو انہیں بتایا گیا کہ اب ان کا صرف ایک ہی بھائی ہے۔ یعنی ہمارے چچا نذیر احمد۔ میں نے اپنے ابا کو دیکھا تو سخت مضمحل پایا۔ کیونکہ انہوں نے نہایت کم سنی میں ہمارے دادا کے انتقال کے بعد ہمارے بڑے دادا ہی کو اپنا باپ جانا اور ان کے تمام بچوں کو جو عمر میں ابا سے چھوٹے تھے اپنا بہن بھائی سمجھا۔ اس رشتہ سے وہ ہماری ممانی کو ہمیشہ اپنی حقیقی ہمشیر بتاتے رہے مگر اس کے انتقال کے بعد یہ امر ان کے دوہرے صدمے کا موجب بنا کہ ان سے بھائی ہونے کا یہ مقدس رشتہ بھی چھن چکا تھا ؂

"رشتہ و پیوند" کا یہ کالم تشنہ رہے گا۔ اگر اس میں یہ تذکرہ نہ کیا جائے کہ مذکورہ بالا "خ" صاحب کے چچازاد بھائی بشارت علی خاں نے جن سے میرا رشتہ محض یہ ہے کہ وہ میری چچازاد ہمشیرگان کے دیور ہیں اور میرے تایازاد بھائی عبدالسلام کے ہم زلف ہیں۔ اشد ضرورت پڑنے پر مجھے تین صد روپے قرض دیا اور طویل مدت تک اس کی واپسی کا تقاضا نہ کیا۔ میں نے حسب آسانی وہ روپیہ از خود انہیں واپس کیا۔ کچھ ایسا ہی حسنِ سلوک ان کے چھوٹے بھائی لیاقت علی خاں المعروف "خواجہ" نے بھی کیا تھا۔ جس سے اگر پوچھا جائے کہ میرا اس کا رشتہ کیا ہے، تو وہ کہتا ہے کہ یہ میرے بھائی ہیں ؂

ساغر صدیقی

امرت سر میں خوب صورت اور چھیلا نوجوان تھا۔ شعر و شاعری میں وہیں
معروف ہو گیا تھا۔ میرے چچا رانا غلام حسن بخت کے ہمراہ مشاعروں میں شریک
ہوتا تھا اور بہت سی خوب صورت غزلیں کہنے میں نامور ہو رہا تھا کہ پاکستان بن
گیا۔ کچھ عرصہ ساغر کھنکتا رہا۔ سوٹ بوٹ میں ملبوس، پھر نہ جانے کیا ہوا ساغر
کا لباس اُتر گیا اور اس کے چہرے کی رونق ڈوب گئی۔ سر پر چڑیوں نے گھونسلا بنا
لیا۔ آج وہ زندہ ہوتا تو ہپیوں کا شہزادہ ہوتا مگر وہ یہاں سے چلا گیا۔ دُور
بہت دُور، جہاں سے کبھی کوئی لوٹ کر نہ آیا۔

میں "ندائے ملت" میں تھا تو وہ روزانہ ایک پھیرا ضرور ڈالتا۔ میں تین بجے
سہ پہر کے لگ بھگ کیپسٹن کی ایک ڈبیہ منگوا کر اپنی دراز میں رکھ لیتا۔ وہ
ٹھیک تین بجے آتا۔ دراز سے ڈبیہ نکالتا۔ دریں اثناء چائے آجاتی وُہ اسے
ایک یا دو سانسوں میں ختم کرنے کی کوشش کرتا "نعیم بھائی چار آنے چاہئیں یا
"یہ تازہ غزل ہے"۔ "مجید صاحب کو بھجوا دو" چنانچہ اس کی تازہ غزل جس میں
پرانے ساغر کا سارا نشہ موجود ہوتا۔ میں نظامی صاحب کو بھجوا دیتا یا خوُد ان کے
سامنے لے جاتا۔ نظامی صاحب ایک چھوٹے سے کاغذ پر عبدالحمید پال کیشئر کے
نام ہدایت جاری کرتے اور یوں بقول ساغر اس کے وارے نیارے ہو جاتے
اور پھر کئی روز تک مجھے ہی نہیں سگریٹ کی ڈبیہ کو بھی اس کا منتظر رہنا پڑتا۔

سوہنی دھرتی

سوہنی دھرتی یعنی سرزمین گجرات میں وہ مبارک احمد بھی کبھی مل جاتے ہیں جن کا تذکرہ کئے بغیر اخبارات کے اَدبی صفحے چھپ نہیں سکتے۔ ادبی مجاوروں سے ان کے کالم کا کچھ حصہ اپنے لئے وقف کرا لینا بہت بڑے کریڈٹ کی بات ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مبارک احمد کے پاس کوئی "گدڑسنگی" ضرور ہے مبارک احمد کے علاوہ یہاں "اینڈ آر مقبول جان جیسے اُردو اخبار "اوریا مقبول جان" لکھتے ہیں اپنے خوب صورت جسم اور دل کش شعروں کے ساتھ مل جاتا ہے۔ اس کا بھائی ابراہیم عباسی بھی نظر آجاتا ہے گو اس کو دیکھ کر ابراہیم عباسی (خلافت بنی عباس) کا خوف دِل سے نکل جاتا ہے۔

مسعُود احمد بھی ہوٹل میں بیٹھتا ہے۔ جس کے دائیں ہاتھ "کرنل" اور بائیں ہاتھ "طارق" ہوتا ہے۔ ان دونوں کے درمیان میں وہ سیاہ حاشیہ میں لگی کسی حور شمائل کی تصویر بن جاتا ہے جو دل ونگاہ پر بجلیاں گرا کر مستیاں بکھیرتی ہے اس کی موٹی موٹی شفاف آنکھیں گہری جھیل سے سر نکالنے والے اس بلّور سے مشابہ ہیں۔ جن میں پھولوں کا سارا رس جمع ہو۔

یہیں وہ صحافی بھی نظر آتا ہے جو اپنے قد کاٹھ اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے سہ منزلہ ہے۔ مگر جس پر کوئی لفٹ نہیں ہے۔ زمین پر کھڑے ہوکر بآسانی آسمان سے تارے توڑ لانے والے اس صحافی کا نام "رمضان صاحب" ہے جس کے دائیں بائیں "منکر نکیر" ہوتے ہیں۔

مہر محمد سلیمی بھی کنجاہ سے یہاں آتا جاتا رہتا ہے۔ جس کے ہاتھ پر عمر کی لکیر یہ بتاتی ہے کہ وہ گردشِ زمانہ اور آفات سماوی سے بچ نکلے گا اور تقریباً سو سال تک زندہ رہے گا۔

تیسری جنس سے تعلق رکھنے والے وہ مادر پدر آزاد چھوکرے اور صاحبزادے بھی یہاں مل جاتے ہیں۔ جن کے باپ دادا پرانے وقتوں میں خواجہ سراؤں کے رُوپ میں محل کے اندر اور باہر "خدمات" سر انجام دیا کرتے تھے۔

منڈی بہاؤالدین کے صحافیوں کا غول جن میں نذیر قریشی، سجاد انبالوی ڈاکٹر رحمت اللہ۔ منیر چودھری، شفیع عدیل وغیرہم شامل ہیں۔ کبھی کبھار یہاں پھیرا ڈالتے ہیں۔

چھوٹے خاں بھی یہیں اپنی سو سالہ پرانی سائیکل سمیت آتا ہے جس کی جیب میں پندرہ بیس پنسلیں، قلم اور کئی ڈائریاں چھپی ہوتی ہیں۔ اس کی سیاہ رنگت اور چپٹی پھینی ناک دیکھ کر کوئی یہ گمان نہیں کر سکتا کہ وہ چھوٹے خاں نہیں، بڑے خاں ہے۔ جس کا دِل بہت خوبصورت ہے۔

اور بھی بے شمار اچھے بُرے لوگ یہاں موجود ہیں ان کے علاوہ یہاں وہ حویلیاں بھی ہیں۔ بالکونیاں بھی ہیں اور محل بھی ہیں۔ جہاں کبھی حسینائیں کمر کو بل دے کر، قیامت کی انگڑائیاں لیتے ہوئے، لچکتی، ناچتی گاتی لانبی زلفوں کو کھولے نگاہوں کے تیر برساتی ہوں گی۔ وہ گلیاں بھی ہیں جنہوں نے نیزوں، بھالوں اور خنجروں سے لیس مسلح حملہ آوروں اور قلعے کے محافظ فوجوں میں کئی بار گھمسان کے رن دیکھے ہیں۔ وہ بڑے بڑے دروازے بھی ہیں۔ جہاں سے راجوں، مہاراجوں اور رانیوں کے خوب صورت اور بارعب جلوس نکلتے ہوں گے۔ وہ کمیں گاہیں بھی ہیں۔ جہاں عشق و محبّت کے کھیل بآسانی کھیلے جاتے ہوں گے اور وہ نیم تاریک ڈیوڑھیاں اور کمرے بھی ہیں۔ جہاں معمولی سی خطا پر طاقت ور کمزوروں کے سر قلم کر کے تماشا دیکھتے رہے ہیں۔ وہ اُونچے

برج بھی ہیں۔ جنہیں بنانے والوں کا نام و نشان بھی مٹ چکا ہے۔ قلعے کی وہ فصیل بھی ہے جہاں پہرے داروں کے پرے کے پرے "ہوشیار۔ ہوشیار" کی آوازوں سے آسمان سر پر اٹھا لیا کرتے تھے۔ مگر آج ان آوازوں کی صدائے بازگشت بھی سنائی نہیں دیتی

کئی سماجی اور رفاہی انجمنوں کا صدر اور "نوائے گجرات" کا نوجوان محنتی اور اپنے کام سے کام رکھنے والا ایڈیٹر محمد اسلم بٹ بھی سٹی پوسٹ آفس کے سامنے رہا کرتا تھا جہاں آج بھی اس کے اخبار کا بورڈ آویزاں ہے اور کمرے کی چابی بھی اسی کے قبضے میں ہے مگر اب وہ قاضی امام شاہ میں اچھے دنوں کا منتظر ہے۔

ایک اور پرانا اخبار نویس اصغر علی گھرال بھی یہاں کچہریوں میں ملتا ہے۔ اور دلی محبت و شفقت سے اخبار نویسوں کو مشورہ دیتا ہے کہ ان کا کچہری میں مارے مارے پھرنا اسے کچھ اچھا نہیں لگتا۔ کیونکہ یہ کام ان لوگوں کو سجتا ہے جو تھانے کچہری میں پھیرے ڈالتے رہنے کے عادی ہیں۔

سیّد مودُودی

گورداسپُور سے جو ریلوے لائن دائیں بائیں واقع تھی۔ اس کے ایک جانب آخری ریلوے اسٹیشن قادیان تھا جب کہ دوسری جانب کا آخری اسٹیشن پٹھانکوٹ تھا۔ قادیان کو اگر جناب مرزا غلام احمد قادیانی اور ان کی جماعت نے خدمت اسلام و عظمتِ قرآن کا مرکز قرار دیتے ہوئے دارالامان قرار دیا تو پٹھانکوٹ میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی نے دارالاسلام کے نام سے اپنا اور آئندہ معرضِ وجود میں آنے والی سیاسی و مذہبی جماعت کا مرکز قائم کیا۔

جیسا کہ بعض واقعات سے ثابت ہوگا میں مہم جُو اور متجسّس ذہن کا مالک ہوں جس کا اظہار نہایت کم سِنی میں شروع ہوگیا تھا۔ اکثر و بیشتر گھر سے یا سکُول سے غائب ہو جانا۔ گاڑی میں بلا ٹکٹ سفر کرنا، نئے نئے شہر دیکھنا، علماء کی تقریریں، مناظرے مباحثے سننا، محفل سماع میں شریک ہونا، شادی بیاہ کے مواقع پر یا بچوں کی پیدائش کے سلسلے میں جو مجرے لگتے جاتے تھے۔ ان میں بن بلائے مہمان بن جانا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ ایک روز حسبِ معمول ریل گاڑی کے اُونچے درجے میں بغیر ٹکٹ بڑے ٹھاٹھ سے سفر کر رہا تھا کہ ایک صاحب ڈبے میں داخل ہوتے انھوں نے چوڑی دار پاجامہ علی برادران سے ملتی جُلتی سیاہ ٹوپی اور کالی شیروانی پہن رکھی تھی۔ ان کے ڈبے میں داخل ہوتے ہی گاڑی چل پڑی، جبکہ ان کے باقی ساتھی دوسرے ڈبوں میں چڑھ گئے۔ نو وارد نے چشمہ آنکھوں سے اتار کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بعد ازاں میرے برابر والی سیٹ پر جگہ بنانے کے بعد بیٹھ گئے اور کچھ توقف کے بعد لفظوں کو چبا چبا کر استفسار کیا "میاں صاحبزادے کہاں جا رہے ہو"۔ میں نے بلا توقف عرض کیا کہ پٹھانکوٹ میں ایک جلسہ ہے۔ وہاں جا رہا ہوں۔ انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا بلکہ یوں کہنا چاہیے گھورا اور ایک لمبی سی "ہوں" کر کے خاموش ہو گئے۔ جب گاڑی چاکولاڑی پہنچی تو کچھ آدمی ڈبے میں داخل ہوتے اور انہوں نے اِن صاحب سے نہایت عقیدت

سے مصافحہ کیا اور مؤدب ہو کر کھڑے ہو گئے۔ سرنا ریلوے اسٹیشن پر بھی اسی طرح لوگوں نے جن کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ ان سے مصافحہ کیا اور پٹھانکوٹ تک ان کا ساتھ دیا۔ ریلوے اسٹیشن پر ان کا سامان کچھ نوجوانوں نے اٹھایا تو ایک آدمی نے میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے یہ کہہ کر نیچے کھینچ لیا کہ چلو اترو بھی۔ میں سمجھا یہ ریلوے کا کوئی آدمی ہے جو مجھے بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں گرفتار کر رہا ہے اتنے میں اس نے میرا ہاتھ اپنے ایک اور ساتھی کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا کہ یہ بھی مولانا کے ساتھ ہی آیا ہے۔ چنانچہ مجھے بصد احترام "دارالاسلام" پہنچا دیا گیا۔ جہاں مجھے معلوم ہوا کہ میرے دل کش بزرگ ساتھی کا اسم گرامی مولانا مودودی ہے۔ انہی دنوں جماعت کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے مطابق جماعت کا مرکز دارالاسلام (بستی جمال پور) پٹھانکوٹ سے "پونچھ روڈ" مبارک پارک لاہور منتقل کر دیا گیا۔ انتقال مرکز کے اس موقع پر مولانا نے تحریر کیا کہ "ہمیں کسی زمین کی خاک سے کوئی دل چسپی و محبت نہیں ہے۔ محبت اس نصب العین سے ہے کہ اللہ کا کلمہ سب کلموں پر غالب اور اس کا قانون سب قوانین سے بالاتر ہو۔ اس لیئے مقصود کے پیچھے جہاں جہاں جانے کی ضرورت ہو گی۔ جائیں گے اور جس جس سرزمین کی خاک چھاننی پڑے گی۔ چھانیں گے"

انہی دنوں مولانا نے بتایا کہ "ادارہ دارالاسلام کا دستور العمل شائع ہوئے تقریباً تین مہینے ہو چکے ہیں۔ اس دوران میں ہمارے ارکان کی تعداد پانچ سے بڑھ کر چھ ہو گئی ہے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ چھٹی رُکن ایک خاتون ہیں۔۔۔ ۔۔۔ ہم اپنے آپ کو اس وقت خوش نصیب سمجھیں گے۔ جب اس ٹھنڈی رفتار کے ساتھ ہمیں آٹھ نو کروڑ مسلمانوں کی اس بستی میں سے پچاس مومن قانت مل جائیں گے"

مولانا مودودی جن کا نام ان کے ایک جد امجد ابوالاعلیٰ مودودی کے نام پر رکھا گیا تھا اور جو حضرت مودود چشتیؒ کی نسل سے ہیں، جن کا شجرہ حضرت علیؓ سے جا ملتا ہے کم گو اور کم خور تھے۔ انہوں نے اپنے لئے جو اصول وضع کر رکھے تھے۔ ان سے سرمو انحراف

کرنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ ان کے ایک درجن سے کچھ زائد جاں نثار ساتھی جن میں جماعت کے نائب امیر مولانا امین احسن اصلاحی جیسی نابغہ روزگار ہستی بھی شامل تھی۔ محض ایک لفظی اختلاف کی بنا پر ان سے اور جماعت سے الگ ہو گئے۔ مگر مولانا مودودی کو ان کے مؤقف سے اِدھر اُدھر نہ کیا جا سکا۔ مولانا نے اسلامی تاریخ سیاست اور مذہب کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ جماعت کو مربوط، منضبط اور مضبوط بنانے کے بعد سیاست پر احاطہ کیا جا سکتا ہے چنانچہ انہوں نے ابتداء میں اپنی جماعت کو تحمل، بُردباری اور برداشت کی تعلیم دی۔ یہی وجہ ہے کہ پٹھانکوٹ تک جماعت کے افراد وسعت قلبی اور قوتِ برداشت کے لحاظ سے اپنی مثال آپ تھے۔

میں نے مولانا کو پٹھانکوٹ میں ایک دُوسری دینی و مذہبی جماعت کے مبلغین سے تبادلہ خیالات کرتے سُنا تھا۔ جہاں انہوں نے اپنے ساتھیوں کو کمال تحمل اور بُردباری اختیار کرنے کا حکم دیا۔ یہی تعلیم و تلقین اگرچہ وہ بعد میں بھی کرتے رہے مگر جماعت کے پھیلاؤ کے باعث ارکان میں جبر و سختی کے جذبات در آئے تھے۔ تاہم جہاں تک مولانا کی اپنی ذات کا تعلق ہے ان میں وہی بردباری اور برداشت آخری دم تک موجود رہی۔

مولانا نے سیاست اور مذہب کو یکجا کرنے کے لئے اسلامی تاریخ کو کھنگالا اور اپنے موقف کی حمایت میں بے شمار قیمتی کتابیں لکھیں۔ افسوس یہ کہ مولانا اپنے مقام اور حیثیت کے بارے میں مصلحتاً یا کسی مجبوری کے تحت کوئی تعین یا وضاحت نہ کر سکے۔ غالباً اس کی بنیادی وجہ مسلمانوں کے ماضی کے تجربات ہیں اور ان کا عدم اتفاق اور کئی فرقوں اور جماعتوں میں بٹ جانا ہے۔ تاہم مولانا کی تحریروں میں کئی بار ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی ذات کے بارے میں کچھ کہنا چاہتے ہیں۔ قرآن حکیم کی تفسیر "تفہیم القرآن" بلاشبہ ان کا ایک ایسا کارنامہ ہے جس پر آنے والی نسلیں بجا طور فخر کر سکیں گی اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان قوم ان کے علمی کارناموں

کو فراموش نہ کر سکے۔ گو جماعت کے صاحبِ ثروت افراد بھی بعض دیگر جماعتوں کے افراد کی طرح اپنے ساتھیوں اور بھائیوں کی معاشی حالت کو سدھارنے کی جانب توجہ نہیں دیتے اور محض اعتقادی اصلاح کو ہی کافی خیال کرتے ہیں۔ جب کہ معیشت کی اصلاح کے بغیر اعتقادی اصلاح مکمل نہیں ہو سکتی اور ہر وقت "کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا" کا خدشہ بلکہ دھڑکا لگا رہتا ہے ؎

سیّد سجاد احمد

سید سجاد کو میں سجاد حیدر یلدرم کی مناسبت سے کبھی کبھی یلدرم بھی کہہ دیتا ہوں قسمت کے معاملے میں کافی حد تک میرا ہم پلّہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ دو بیویوں کا بیک وقت شوہر ہے اور دونوں ہی سے کئی بچوں کا باپ ہے۔ اکاؤنٹس کا کام بھی جانتا ہے اور علم و ادب میں بھی درک رکھتا ہے۔ کئی سال قبل بے کاری اور مہنگائی کا علاج کرنے کے لئے جو میڈیکل سٹور اس نے کھولا تھا اس میں کچھ وقت گزرنے کے بعد صرف الماریاں ہی باقی رہ گئی ہیں جنہیں دیکھ دیکھ کر اس کی پیشانی پر فکر کی لکیریں پہلے سے کہیں زیادہ گہری ہو گئی ہیں۔ جن دنوں وہ اور میں کوہستان اخبار میں کام کرتے اور ایک ساتھ فاقے کھایا کرتے تھے۔ ایک روز اس نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس رہائش کے لئے کوئی اچھی جگہ نہیں ہے۔ میں ان دنوں رام گلی میں رہتا تھا۔ چھوٹے سے ایک کمرے میں ایک چارپائی تھی۔ میں نے کہا شاہ صاحب میرا غریب خانہ حاضر ہے۔ چنانچہ وہ میرے ہمراہ چلے آئے۔ چارپائی ایک تھی۔ ہم دو آدمی۔ شرط یہ ٹھہری کہ چارپائی پر گرنے سے پہلے جتنا ہلنا جلنا ہو ہل جل لیا جائے۔ بعد ازاں اس کی اجازت نہ ہو گی۔ مبادا چارپائی کڑک کر جائے چنانچہ دم سادھ کر لیٹنے یا بہ الفاظ دیگر گم ہو جانے کی یہ مشقیں کئی ماہ تک جاری

رہیں۔ رات کے ایک دو بجے کم بخت بھوک روزانہ ستانے لگتی تھی۔ حالانکہ کھانا کھائے چوبیس گھنٹے سے زائد کا عرصہ نہیں گزرا ہوتا تھا۔ چنانچہ ہم دونوں نہایت آرام سے اُٹھتے۔ رام گلی کے کسی شبینہ ہوٹل یا ریلوے سٹال کی راہ لیتے۔ کچھ کھا پی کر نہایت اطمینان سے اُٹھتے اور ہوٹل والے سے پُوچھتے کہ اسے ہمارے پہنے ہوئے کپڑوں میں سے کونسا کپڑا پسند ہے؟ وہ حیرت سے ہماری جانب دیکھتا اور جب اسے یہ پتہ چلتا کہ ہم ملنگ سفید پوش ہیں۔ تو وہ پان بھی پلّے سے کھلاتا یا وہ ہم خود کسی پان والے سے محبت کی قینچی چلا کر کھا لیتے۔ ایک بات ضرور ہم نے اپنے پلّے باندھ رکھی تھی کہ جب کبھی پیسے ہمیں ملتے ہم سیدھے ان ہوٹلوں پر اور پان والوں کے پاس جاتے اور ایک ایک پیسے کا باقاعدہ حساب کر کے انہیں پیسے دیتے۔ اس فاقہ کشی کی وجہ کیا بیان کروں۔ شاعر اور ادیب وُہ بھی ہے، اب اس کے بعد کچھ اور بتانے کی حاجت ہی کہاں رہتی ہے البتہ وہ مجھ سے سخت نالاں رہتا ہے کہ تم نے اپنی کوئی لائن طے نہیں کی۔ مستقبل نہیں بنایا مستقل مزاجی تمہارے اندر ہے ہی نہیں وغیرہ وغیرہ۔ میں سُن کر مسکرا دیتا ہوں۔ ہے میرا دوست مگر یہ بھی نہیں سمجھ پایا کہ یہ تمام خوبیاں صرف خدا کو زیب دیتی ہیں۔ پھر غیر مستقل مزاجی میں استقلال کو قائم رکھنا ہی تو اصل مستقل مزاجی ہے ۞

سیّد سہیل انور

وہ میرے دوستوں میں واحد دوست ہے جو اپنی آمد کی اطلاع "ڈھول بجا کر دیتا ہے اور ڈھول بھی اپنے ہمراہ نہیں لاتا بلکہ مخاطب کے جسم کے کسی بھی حصے پر وُہ اپنا آہنی ہاتھ اتنے زور سے مارتا ہے کہ بے چارے کا بھُرکس نکل جاتا ہے اس کاری ضرب کے ساتھ ہی دوسرا وار وہ اپنی زبان سے یوں کرتا ہے "چل بھئی مرغ کڑاہی کھوا" آہنی مُکے سے جو سخت جان بچ نکلتا ہے اس کا دم اس تقاضے کے بعد نکل جاتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مُرغ حلال کرنے کے بعد سید سہیل انور صاحب اِدھر اُدھر گھوم پھر کر اور مفلس دوستوں کو سسپنس میں مبتلا کرنے کے بعد اپنی جیب سے اس کے دام چکا دیں جس میں بالعموم تین چار صد روپے پڑے رہتے ہیں۔ اِدھر مرغ کھایا اور اُدھر سہیل شاہ کو پھر بھوک نے آستایا۔ چلو بھئی کھیر کھلاؤ۔ کھیر بھی کھا لی گئی۔ چلو یار دودھ پئیں۔ ہم نے معذرت کی کہ شاہ جی ہمارا پوٹا مرغ کا نہیں۔ چنانچہ وہ اپنے بھاری بھرکم وجود کو تن تنہا گھسیٹتے ہوئے دودھ پینے کے لئے چل دیئے۔ تھوڑی دیر کے بعد کیا دیکھتے ہیں کہ شاہ جی سیخ کباب پر طبع آزمائی فرما رہے ہیں پوچھا۔ سہیل شاہ یہ کیا۔ جواب ملا۔ صبح سے میٹھی چیزیں کھاتے کھاتے تنگ آ گیا ہوں۔ سوچا ذرا منہ کرارا کر لیا جائے۔

شام ہوتے ہی آنکھیں بند کر کے کہیں گے۔ یار نیند آئی ہے۔ صبح ذِنت پر سکول جانا ہے۔ بس آج ٹھیک آٹھ بجے سو جانا ہے۔ نو بج جائیں گے۔ دس بج جائیں گے، گیارہ بج جائیں گے۔ وہ بار بار گھڑی دیکھیں گے اور اپنا فقرہ اِسی طرح دہراتے جائیں گے۔ جیسے سکول میں ان کے طالب علم انہیں اپنا سبق سناتے

ہیں۔ بارہ ایک بجے محفل سے اٹھیں گے اور سب کو بُرا بھلا کہیں گے۔ کہ تم نے وقت پر سونے نہیں دیا۔ اب صبح سکول سے ناغہ ہو جائے گا۔ اگلے روز ان کے گھر سے دو فرلانگ کے فاصلے پر جو گرم حمام ہے اس کا مالک آواز دے رہا ہو گا " اجی سُنیئے شاہ صاحب صبح پانچ بجے نہانے کے لیے آئے تھے اور اپنی فلاح چیز یہاں بھول گئے ہیں وہ تو لے جایئے۔" وہ بھُولی ہوئی چیز پہنچانے سکول جانا ہو گا۔ وہاں کیا دیکھتے ہیں کہ ماسٹر سہیل شاہ کسی چیز پر کچھ لکھ رہے ہیں۔ قریب جا کر غور سے دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ "تختہ مشق" تختہ سیاہ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ جو بے چارہ سارے کا سارا سہیل شاہ کے پیچھے چھُپا کھڑا تھا ۔

سہیل شاہ کو دوسروں کے ساتھ مل کر کھانے اور دوسروں کو کھلانے پلانے کا چسکا مرض کی حد تک ہے۔ اس کے اس " اشتیاق کا خمیازہ اکثر اس کے گھر والوں کو بھی بھگتنا پڑتا ہے جنہیں اس کے دوستوں کے لئے کبھی دیسی گھی میں مُولی کے پراٹھے تلنے پڑتے ہیں اور کبھی فرمائشی کوفتے بنانے ہوتے ہیں۔ رمضان کے ایام میں وہ اپنے ایسے دوستوں کو بلاناغہ سحری کے وقت اپنے گھر لا کر ان کا روزہ رکھوانے کا اہتمام کرتا ہے۔ جو سحری کا اہتمام نہیں کر سکتے۔ کبھی کسی سے شدید ناراض ہو جائے تو وہی روایتی کسّن استعمال کرتا ہے اور کہتا ہے" توں بندیاں والی گل کیتی اے" اور ساتھ ہی اسے قلاقند کھانے کی دعوت دے کر اپنا سینہ ٹھنڈا کر لیتا ہے ۔

س ۔ ش ۔ ص

۱۹۶۵ء کی جنگ میں باٹا پور کی نہر تک کا علاقہ بھارتی توپوں کی براہِ راست زد میں آ گیا تھا نہر کے اطراف میں جیالے پاکستانی محافظوں نے اپنی جانوں کے نذرانے دے کر وطن کی حفاظت کا مقدس فریضہ ادا کیا تھا۔ اِن دنوں جب کہ کے سی فیکٹری، سبیل اور سوئمنگ پول کی دیواروں پہ مارٹر کا فائر آ رہا تھا۔ باٹا پور مکمل طور پر خالی کروا لیا گیا تھا۔ باٹا کالونی کے کئی رہائشی بلاک جنگ میں بالکل صاف ہو گئے ان میں وہ بلاک بھی شامل تھا۔ جس کے ایک کوارٹر میں میری ایک خالہ، خالو اور ان کے بچے رہائش پذیر تھے۔ کچھ لوگ سوچتے ہوں گے کہ رہائشی کوارٹروں کی یہ لائن جو کئی بلاکوں پر مشتمل تھی ہمیشہ کے لئے نہ جانے کیوں ختم ہو گئی ہے لیکن واقفِ حال جانتے ہیں کہ اس لائن میں جنگ سے کئی برس بیشتر جو عبرت انگیز واقعہ رونما ہوا تھا اس کا بھی اس ردوبدل میں گہرا ہاتھ ہے اور بلاکوں کی یہ لائن اسی قابل تھی کہ اس کا نام ونشان مٹ جاتا۔

ہوا یوں کہ انہی کوارٹروں میں ایک صاحب "ش" اپنے بیوی بچوں کے ہمراہ سکھ چین کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ "ش" کی بیوی بہت سلیقہ شعار سگھڑ خاتون تھیں، بچے بھی پانچ چھ تھے۔ جو صحت مند اور خوب صورت تھے جب کہ "ش" بے حد دبلا، پتلا اور مریل قسم کا آدمی تھا۔ اس کی بیوی اس کی خوراک کا خاص خیال رکھتی اور روزانہ اپنے ہاتھوں سے باداموں کی "سردھائی" تیار کر کے اسے پلاتی تھی۔ ایک بار جب اس کے ہاں ایک اور بچے کی ولادت متوقع تھی اس نے اپنے میکے یعنی گوجرانوالہ سے اپنی سولہ سترہ سالہ ہمشیرہ "س" کو بلوایا۔ "س" چند روز تک تو سادگی کا مرقع بنی رہی۔ لیکن اس کے بعد اچانک اس نے بھڑکیلا لباس اور شوخ میک اَپ کرنا شروع کر دیا۔ ہمسائیوں نے اس تبدیلی

کو محسوس کرتے ہوئے بڑی بہن "ص" کو توجہ دلائی۔ وہ بے چاری انتہائی شریف اور صاف دل کی عورت تھی کہنے لگی "بچی ہے کوئی بات نہیں،، ابھی اس کا نومولود چند ہی روز کا تھا کہ س شؔ دونوں گھر سے غائب ہو گئے۔ صؔ نے پھر بھی حسن ظن سے کام لیا لیکن تابکے بات دُور تک جا پہنچی۔ گوجرانوالہ سے اس کی والدہ اور بھائی وغیرہ آ گئے اور وہی گھر جہاں مسرت و شادمانی کا ڈیرہ تھا۔ ماتم کدہ بن گیا۔ والدہ اور بھائی نے کہا کہ "س" ہمارے لیے مر گئی۔ چنانچہ صؔ کو گوجرانوالہ لے جانے کے انتظامات کیے گئے۔ اس کا سامان ٹرک پر رکھنے والے رنجیدہ و کبیدہ خاطر ہمسایوں میں، میں بھی شامل تھا۔ س اور ش کچھ دیر ادِھر اُدھر چھپے رہے بعد ازاں شؔ اپنی ڈیوٹی پر حاضر ہو گیا اور اس نے باٹا کالونی سے باہر مکان کرائے پر لے لیا۔ صؔ اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کو لئے گوجرانوالہ میں رات دن روتی دھوتی رہی۔ دریں اثنا سؔ کے بطن سے بھی اس مریل سے شؔ کے کوئی نصف درجن بچے پیدا ہو گئے بظاہر سؔ، شؔ کے ساتھ خوش و خرم تھی۔ لیکن اپنی بڑی بہن کے ساتھ جو سلوک اس نے کیا تھا وہ کوئی ایسا نہ تھا کہ وہ اسے فراموش کر سکتی۔ چنانچہ اندر ہی اندر ضمیر کی یہ خلش ناسور بنتی گئی۔ اِدھر بچوں کی تعداد میں بے پناہ اضافہ نے اس کی صحت اور جوانی کو گھُن کی طرح چاٹ لیا۔ خدا کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آئی اور سؔ کو ٹی بی ہو گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ موت کا فرشتہ اس کے ارد گرد منڈلا رہا ہے تو اس نے خدا اور رسول کا واسطہ دے کر اپنی بڑی بہن کو بلوایا۔ اتنے بڑے واسطے کو وُہ خدا ترس خاتون رد نہ کر سکی۔ چنانچہ بادل نخواستہ اپنی عاقبت نا اندیش، بے رحم ظالم بہن اور سوکن کو ملنے چلی آئی۔ سؔ اپنی زندگی کی آخری منزل پر تھی۔ اس نے مرتے مرتے بہن کے قدموں پہ سر رکھ دیا اور کہنے لگی "خدا کے لئے مجھے معاف کر دو،، بڑی بہن نے اس کی یہ حالت دیکھی تو روتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔ سؔ نے اپنے بچے بھی اس کی جھولی میں ڈال دیئے اور آخری ہچکی لینے کے بعد دم توڑ دیا۔ اس کے مرنے کے بعد

ص نے بھی ش سے معافی مانگ لی

اس باٹا کالونی میں مردوں اور عورتوں کے لئے الگ غسل خانے اور بیت الخلا ہیں۔ کوارٹر بھی انتظامیہ نے بہت اچھے تعمیر کئے ہوتے ہیں لیکن ایک تو وہ کوارٹر بہت چھوٹے ہیں اور محض ایک آدھ کمرے پر مشتمل ہیں جب کہ غرباء اور متوسط طبقہ کے ملازمین کے بچوں کی تعداد امراء سے کہیں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر یہاں معاملہ عجیب و غریب ہے۔ غرباء کو ضرورت سے کہیں تھوڑی جگہ دی گئی ہے۔ جب کہ امراء کو بڑے بڑے بنگلے اور کوٹھیاں ملی ہوتی ہیں۔ اس کالونی میں آم کا ایک درخت بھی ہے جو ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو لگایا گیا تھا۔ عجیب بات ہے کہ آم کا وہ اصل پودا جو آزادی کے روز لگایا گیا تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد سوکھ گیا اور اس کی جگہ فوراً ہی دوسرا آم لگا دیا گیا۔ شاید اس اصل اور پہلے والے آم نے مشرقی پاکستان کی علیحدگی کو محسوس کر لیا تھا۔ کہ اس صدمے نے اس کی جان لے لی

سیّد طاہر علی رضوی

اخبارات کے دفاتر میں جب سید طاہر علی رضوی نے آنا شروع کیا تھا وہ ایک ایسا جاذبِ نظر نوجوان تھا جو اکثر کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہتا تھا۔ مگر اب اس کی کنپٹیوں میں سفیدی جھانکنے لگی ہے۔ وہ تب سے اب تک تسلسل اور تواتر سے مرحوم قائدین و عمائدین پر قیمتی مضامین لکھ کر ان کی یاد کو سینے سے لگا کر دوسروں تک پہنچانے میں مصروف ہے۔ جسٹس کیانی کی برسی ہو یا سردار نشتر کی قائداعظم کا یومِ وصال ہو یا حادثہ کربلا کی یاد دلانے والے پرہول ایام، طاہر علی رضوی کا معلوماتی مضمون اخبارات میں بالضرور شائع ہوگا۔ وفاداری بشرطِ استواری کی یہ خوبی اس دور میں جس شخص میں مل جاتے وہ فی الواقع قابلِ مبارکباد ہے۔

سید محمود شاہ

پیر ولایت شاہ کے صاحبزادے ہیں۔ عالم، فاضل اور پرجوش مقرر ہیں۔ واحد دینی رہنما ہیں جو لگی لپٹی رکھے بغیر اپنا مدعا بیان کر جاتے ہیں۔ مسجد حاجی پیر بخش کی بالائی منزل کا ایک کمرہ ان کا "حجرہ شاہ مقیم" ہے، جہاں جمعہ کے روز شاہ صاحب کی طویل بیٹھک ہوتی ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے کے فرش پر دریاں بچھی ہوئی ہیں جن پر سفید شفاف چادریں پڑی ہوئی ہیں۔ ایک آدھ گاؤ تکیہ بھی ہے۔ یہاں شاہ صاحب اپنے ملاقاتیوں کی چائے، بسکٹ، کباب اور مٹھائی سے تواضع کرتے ہیں۔ اس سے پہلے ان کی بارعب اور پرشوکت بلند آواز جسے للکار کہنا زیادہ مناسب ہوگا، اطراف میں گونجتی ہے

اے دیکھنا ذرا مولوی...... صاحب ہین۔ ایتھاں توں ذرا بھیجیو"، مولوی صاحب بھاگے ہوئے آتے ہیں، شاہ صاحب فرماتے ہیں" مولوی صاحب! اوہ مٹھائی والا ویکھیا جے ناں۔ اوہنوں آکھیو شاہ ہوراں مہماناں لئی منگائی اے ذرا دھیان نال لیا جے،، مولوی صاحب مٹھائی لینے چلے جاتے ہیں گے۔ شاہ صاحب ایک لڑکے کو دیکھیں گے" ذرا ایدھر آئیں ناں! او چوک وچ کباب والا ویکھیا ای، اوہنوں آکھیں فسکلاس کباب دَتے۔ ویکھیں ناں نال ودھیا جئی چٹنی تے مُولیاں وی لیاویں،، وہ لڑکا جانے لگے گا تو فرمائیں گے"توں رحمن دے قاری صاحب نسیں ذرا ایدھر آؤنا......،،

چنانچہ کباب اور روٹیاں قاری صاحب لے آئیں گے اور مٹھائی مولوی صاحب مہمانوں اور ملا فاتیوں کے سامنے دستر خوان پہلے ہی بچھا ہوا ہو گا۔ شاہ صاحب ان کو بسم اللہ پڑھنے کے لئے کہیں گے ساتھ ہی ارشاد ہو گا کہ" ویکھنا کوئی ذرہ چادراں تے نہ سٹیو، کیڑیاں .... بڑا استاؤندیاں نیں "، دریں اثنا۔ تعویذ لینے والے آنے لگیں گے۔ شاہ صاحب ان کو گن کر تعویذ دیں گے۔ بعدازاں مدرسے کے طالب علموں کو آوازیں دے کر بلوائیں گے۔ نذرانوں کی صندوقچی سے اٹھنیاں چونیاں نکال نکال کر ان سے پوچھیں گے " توں پہلاں تے نہیں کجھ لیا "، نفی میں جواب دے یا نہ دے۔ شاہ صاحب اس کا روزینہ اس کے حوالے کر کے فرمائیں گے چل ہن جا وی، مَیں مہماناں نال گل پیا کرنا آں "

شاکر حسین قریشی

آج سے کچھ عرصہ پہلے تک "مغربی پاکستان" اخبار کے شیخ شفاعت کے زیرِ سایہ شرکت پروسس قائم تھا۔ شاکر حسین اس کے پروپرائٹر کا نام ہے جو دراصل اس پروسس کا پارٹنر ہے اس کا دوسرا حصہ دار رشید احمد ہے آج تک میں یہ تمیز نہیں کر سکا کہ ان دونوں میں سے کون سا پارٹنر زیادہ خلیق اور با اخلاق ہے ایک سے ایک بڑھ کر شفیق اور ملنسار ہے۔ اخباروں، رسالوں اور پوسٹروں والے دھڑا دھڑ بلاک بنوا رہے ہیں۔ سینکڑوں روپے کے بل ان کی طرف ہیں۔ کام کروانے کے معاملے میں جو پارٹیاں بہت جلدی کا تقاضا کرتی ہیں ان میں سے کئی بلوں کی رقمیں ادا کرنے میں خاصی سُست رفتار ہیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو پیسے مار کر چلی گئی ہیں۔ ایسی نادہند پارٹیوں کی رقوم جمع کی جائیں تو ہزاروں روپے بن جائیں مگر کیا مجال جو شاکر حسین نے اخلاق کا دامن ہاتھ سے کبھی چھوڑا ہو۔ بسا اوقات ایسا بھی دیکھنے میں آیا کہ کسی نادہند سے اس نے پیسوں کا مطالبہ کیا اور اس نے اپنی حالتِ زار کا رونا رو دیا۔ شاکر اس کو ضبط نہ کر سکا۔ اس کا ہاتھ جیب میں چلا گیا اور یوں لینے کے دینے پڑ گئے۔ مدت گزر گئی کئی اخبار والوں، پریس والوں، ہفت روزوں، پوسٹر بازوں نے اس کے پیسے دبا لیے، مگر شاکر حسین کی مروت میں کوئی تبدیلی نہ آئی۔ تبدیلی آئی تو صرف یہ کہ اس کا پروسیس "مغربی پاکستان" والی بلڈنگ سے رائل پارک چلا گیا۔

شالیمار

واپڈا نیا نیا معرضِ وجود میں آیا تھا یا آئی تھی کہ میں نے اس میں ملازمت کرلی اور باغبان پورہ سب ڈویژن میں تعینات ہوُا۔ جہاں عبدالغفور ہاشمی ایس ڈی او تھے بعدازاں وہ ایگزیکٹو انجینئر ہو کر گوجرانوالہ جانے لگے تو وہاں کے کارکنوں نے ان کے اعزاز میں الوداعی ضیافت کا انتظام کیا جس میں راقم الحروف نے بھی ان کے عمدہ طرزِ عمل کے بارے میں تعریفی کلمات کہے۔ وہ تو چلے گئے لیکن دفتر میں مَیں ایک مقرّر کی حیثیت سے متعارف ہو گیا۔ ہمارے ڈویژنل کلرک نام شاید رفیق تھا بہت مرنجاں مرنج آدمی تھے۔ پہلے بھی کام کے سلسلے میں سختی کرنے کے عادی نہ تھے۔ اس کے بعد تو انہوں نے دامن محبت مزید وسیع کر دیا ایک کلرک محمد اشرف تھا۔ محمود بوٹی کا رہنے والا نذیر احمد تھا۔ جلالپور جٹاں کا افتخار احمد تھا اور میں تھا ہم سب ایک دوسرے پر جان چھڑکتے تھے اور یوں کم از کم میرا کام بہت ہلکا ہو گیا اب کوئی نیا پنگا لینے کی سُوجھی۔ باغبان پورہ سب ڈویژن میں سب سے زیادہ اور طویل و عریض علاقہ تھا جو واہگہ بارڈر تک چلا جاتا تھا۔ سٹاف تھوڑا تھا صنعتی مسائل بھی تھے اور ٹیوب ویل بھی بکثرت نصب تھے۔ میں نے حکام متعلقہ کے نام ایک چٹھی لکھی کہ یہ سب ڈویژن اتنے بڑے علاقے کو کنٹرول نہیں کر سکتی۔ مناسب یہ ہے کہ ایک نئی سب ڈویژن قائم کی جائے جسے باغبان پورہ سب ڈویژن کی نصف ذمہ داری سونپ دی جائے۔ سب ڈویژنل کلرک نے میری تجویز کی بھرپور حمایت کی اور یوں ہمیں ایک نیا ٹارگٹ مل گیا۔ ابھی یہ چٹھیاں آجا رہی تھیں کہ میں نے حسبِ عادت اس نوکری کو چھوڑ دیا اس کے کچھ عرصہ بعد ایک روز شیخ محمد اشرف لائن سپرنٹنڈنٹ اول مجھے ملے اور ان کی زبانی پتہ

چلا کر ایک نئی سب ڈویژن یعنی شالیمار نے جنم لے لیا اور باغبان پورہ سب ڈویژن کی ذمہ داریاں اور علاقہ تقسیم ہوگیا ہے۔

ان دنوں کی یادوں میں ایک تو یہ کہ فلم "وامق عذرا" کی شوٹنگ شالیمار میں ہو رہی تھی۔ میں بھی اسے دیکھنے کے لئے گیا تو نیلو پر ایک گانے کی شوٹنگ ہو رہی تھی۔ گانا بعد میں بہت مشہور ہوا ہے "کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے"۔ لیکن جب اس کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو طبیعت سخت مکدر ہوئی۔ ہر چیز جعلی ہیرو جعلی، ہیروئن جعلی۔ گانا جعلی، میک اپ جعلی۔ لاحول ولا قوۃ کٹ کٹ کی آوازوں نے سر کھا لیا۔ کئی روز تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ نیلو کچھ بھی نہ کہتے ہوئے بہت کچھ کہتی رہی مگر ہمارے پلے کچھ نہ پڑا اس کے بعد ہم نے شوٹنگ دیکھنے سے توبہ کر لی۔ طویل مدت کے بعد یہ توبہ بھارت سے آئے ہوئے ایک عظیم فنکار، شاعر، موسیقار یالم نے توڑی جو شاہ نور سٹوڈیو میں زبردستی مجھے پکڑ کر لے گیا اور جہاں اس کے اپنے لکھے اور ترتیب دیئے ہوئے گانوں کی دھنیں اور بول سن کر طبیعت بے حد مسرور اور محظوظ ہوئی۔

دوسری ناقابلِ فراموش بات جنہیں باتیں کہنا چاہیے یہ تھیں کہ محمد اشرف نے گھاس منڈی سے اندر جا کر دوسری منزل پر واقع دو کمروں کا ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جو دراصل ہم چاروں یاروں کا ایمرجنسی ہیڈ کوارٹر تھا۔ اکثر و بیشتر ہم وہاں قیام کرتے اور خوب دھما چوکڑی ہوتی۔ نیچے چاروں طرف جو مکانات تھے ان میں جو لڑکیاں رہتی تھیں۔ انہیں ہم اکثر نظر انداز کرکے گزرتے تھے۔ کیونکہ محلے داری کا معاملہ تھا۔ ویسے بھی ہم یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ دفتر میں ہمارے بارے میں کوئی جا کر یہ شکایت کرے کہ ہمارا اخلاق درست نہیں ہے۔ جب ڈیڑھ دو ماہ یونہی گزر گئے اور ایک روز ہم اپنے مکان کی جانب آ رہے تھے کہ راستے میں ایک مشترکہ نل پر دو لڑکیاں کھڑی تھیں ایک شاید نہانے کی تیاری کر رہی تھی کہ قمیض اتارتے ہوئے اس کی نظر ہم پر پڑی اور اس کے ہاتھ وہیں رُک گئے۔ اتنے میں دوسری بولی "ان کی فکر نہ کرو یہ کوئی مرد تھوڑی ہیں"۔

شرقی بن شائق

اصل نام غالباً مشتاق تھا مگر شرقی بن شائق کے نام سے شہرت پائی، شعر کہنے کی آٹومیٹک مشین تھے۔ کئی بڑے بڑے شعراء جنہیں کسی مشاعرے میں فوری طور پر جانا ہوتا تھا۔ وہ شرقی صاحب کے پاس آتے اور ان کی اس آٹومیٹک مشین سے اپنی پسند کا کلام تیار کروا کے لے جاتے، عمر بھر "مقدر" میں لکھی معاشی پریشانیوں کا مقابلہ کرتے رہے اور ایک روز اچانک اس دُنیا تے فانی سے رخصت ہو کر اپنے تمام غموں کا مداوا کر لیا۔ مجلسی زندگی کو پُر بہار بنانے میں انہیں یدِ طولےٰ حاصل تھا۔ بے تکلف دوستوں میں ایسے ایسے لطیفے چھوڑتے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے۔ قد و قامت اور شکل و صورت کے لحاظ سے بہت وجیہہ تھے۔ دل و دماغ دونوں ان کے چہرے کی رنگت کی طرح روشن تھے۔ لوگوں سے باتیں بھی کرتے رہتے تھے اور اپنی یا ان کی غزلیں اور نظمیں بھی مکمل کرتے چلے جاتے اللہ کے کام بروقت اور پُر حکمت ہوتے ہیں۔ شرقی صاحب کی موت بھی یقیناً بروقت ہوئی ہے ورنہ اب ان میں روز روز مرنے کی تاب نہیں رہی تھی ؛

شوکت حسین شوکتؔ

اخبار نکالنا کوئی فن نہیں البتہ ڈیکلریشن لینا اور اخبار کو چلانا کسی فن کار کا ہی کام ہے۔ ڈیکلریشن لینے کے لئے جہاں صبرِ ایوبؑ کی ضرورت ہے وہاں اخبار چلانے کے لئے عزیزِ مصر بننا پڑتا ہے۔ شوکت حسین شوکتؔ کسی کالج یا یونیورسٹی کا فارغ التحصیل نہیں ہے لیکن اس کے اندر بڑا بننے اور شہرت حاصل کرنے کی اِک آگ بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ الاؤ دہک رہا تھا۔ اپنے اس فطری جذبے اور جبلت کے اظہار کے لئے اس نے اپنی صحافت کا آغاز بھی ہفت روزہ "آتش" سے کیا جو اسم بامسمیٰ تھا۔ میں اکثر سوچتا ہوں اور شوکت اکثر یہ کہتا ہے کہ اگر وہ پڑھا لکھا آدمی ہوتا تو کسی "چیٹر قناتیئے" کے اخبار میں نوکری کرتا جہاں سے چند روپلیاں اسے ماہانہ تنخواہ ملتی بالکل اسی طرح جیسے اب ایم اے پاس حضرات اس کے ہاں ملازمت کرتے ہیں۔ اس کے ان پڑھ رہنے کے ایک نہیں کئی فائدے ہیں۔ اوّل یہ کہ وہ بے خوف اور بے جھجک ہو گیا ہے جو محسوس کرتا ہے لکھ دیتا ہے جسے کچھ لوگ انٹ شنٹ اور نہ جانے کیا کہتے ہیں مگر یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ اس انٹ شنٹ کے باوجود وہ اخبار چلا رہا ہے اور متواتر چلا رہا ہے اور ایک حلقہ اس انٹ شنٹ کو بھی دل چسپی سے پڑھتا ہے کئی سال قبل جب "آفاق" ہفت روزہ تھا اور شوکت کو ایک عدد ایڈیٹر کی ضرورت تھی۔ میں اس کے پاس گیا تو وہ اپنے دوہرے جسم سمیت کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ جب ایک آدھ گھنٹے کے بعد میں کمرے سے باہر نکلا تو ایڈیٹر "آفاق" بن چکا تھا اور پھر ایک طویل مدت تک میں اس ملازمت پر ڈٹا رہا۔ میرا اور شوکت کا بندھن اس حد تک کامیاب رہا کہ آج جب کہ مجھے "آفاق" کو چھوڑے ہوئے بھی

ایک طویل و عریض مدت گزر گئی ہے وہ میری رفاقت کو یاد کرتا ہے بالخصوص ایسے وقت میں یہ یاد خوب گھر کر آتی ہے جب اسے کسی معاون کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔

شوکت کی ذات کا بہت بڑا فائدہ جو مجھے ہوتا رہتا ہے یہ ہے کہ وہ میرا چلتا پھرتا بنک ہے میں جب چاہوں۔ جس وقت چاہوں آفاق کے دفتر جا سکتا ہوں۔ ایک دو گھنٹے کام کرتا ہوں اور چیک کیش کرا کے چلا آتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ چیک صرف دو ہندسوں کا اور دس کے فگر کے لگ بھگ ہی کیش ہوتا ہے کہ اس سے زائد کی اجازت و گنجائش نہیں ہوتی۔ یوں بھی ہو جاتا ہے کہ اشد ضرورت کے وقت بنک ہی بند ہو یا " اندر آنے کی اجازت نہیں ہے " کا نوٹس دروازے پر آویزاں ہو

شوکت کے بارے میں جو لوگ یہ رائے رکھتے ہیں کہ وہ منہ پھٹ ہے غصے میں آجاتا ہے۔ لال بھبوکا ہو جاتا ہے در اصل اس کے سینے میں چھپا شوکت ان کی نگاہوں میں نہیں آتا۔ وہ جتنا منہ پھٹ اور غصیل ہے۔ اتنا ہی صاف گو اور ہمدرد بھی ہے۔ وہ لال بھبوکا ہو جاتا ہے مگر جب نرم ہوتا ہے تو سمیڑیال اور حاصل پور کا کھویا بن جاتا ہے۔ اگر معاشرہ اور سوسائٹی اسے بہترین تربیت سے مزین کرتا تو یقیناً وہ اس دور کا کالیداس ہوتا۔ اب وہ جو کچھ بھی ہے وہ وہی ہے جو اس نے بزور اپنے آپ کو بنایا ہے۔ اس کی حرکات پر ناک بھوں چڑھانے کی نہیں سوچنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے اس کی سب سے بڑی کمزوری محبت ہے۔ جس کی تلاش میں وہ مارا مارا پھرتا ہے۔

شیخ سعید الدین احمد

نوائے وقت کے ایک سابق جنرل مینجر شیخ سعید الدین احمد تھے۔ یہاں سے مدت ہوئی فارغ ہونے کے بعد کئی شوگر ملوں اور دیگر صنعتوں میں ڈائریکٹر کے طور پر کام کرتے رہے، ایک روز مجھے میرے دوست شیخ محمد احمد جو اپنی جسامت اور ڈیل ڈول کی وجہ سے دو چار میل ہی سے بخوبی نظر آ جاتے ہیں، ملے اور کہنے لگے کہ شیخ سعید الدین صاحب آج کل روزنامہ "صداقت" میں آ گئے ہیں۔ ان سے فوراً مل لو۔ کیونکہ اخبار کی اے بی سی (آڈٹ بیورو آف سرکولیشن) کروانے کے لئے انہیں تمہاری تلاش ہے۔ چنانچہ ان کے زور دینے پر میں "صداقت" کے دفتر پہنچ گیا۔ جو مشہور بزرگ صحافی م۔ش کے سر پر بنایا گیا ہے۔ کمرے میں شیخ سعید الدین صاحب "مین چیئر" پر اور سامنے رکھی ہوئی عام کرسیوں میں سے ایک کرسی پر اخبار کے مالک اور چیف ایڈیٹر پروفیسر محمد اسحاق قریشی بیٹھے تھے۔ میں نے جاتے ہی "السلام علیکم" کہا تو دونوں حضرات اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور نہایت خلوص سے ایک دوسرے سے مصافحہ کر کے کہنے لگے "سنایئے کیا حال ہے" میں حیران کہ "الٰہی یہ ماجرا کیا ہے"۔ پتہ چلا کہ دونوں ہی "نظر کی تیزی" کا شکار ہیں۔ اور دونوں نے بیک وقت کسی ایسے ملاقاتی سے مصافحہ کرنے کی سعادت حاصل کی ہے جس کے وہ منتظر بیٹھے تھے بہرحال میں نے اپنا نام بتایا تو شیخ سعید الدین نے ہاتھ بڑھا کر مجھ سے اصل مصافحہ کیا اور فرمانے لگے کہ تم نے فلاں فلاں اخبار کی اے بی سی کروائی ہے، لہٰذا آج ہی سے کام شروع کر دو۔ میں نے کہا کہ جناب آج ہی سے تو ناممکن ہے۔ البتہ ایک ہفتے تک حاضر ہو جاؤں گا۔ اس وقت تک متعلقہ ریکارڈ مکمل کروا دیا جائے یا کم از کم داغ بیل ڈال دی جائے۔ اس پر قریشی صاحب گویا ہوئے کہ فاروق کو: کبھی کہہ

دیا جائے گا اور ایک ہفتہ کے اندر اندر متعلقہ ریکارڈ تیار ہو جائے گا۔ چنانچہ میں وعدے کے مطابق ایک "ہفتے" کے بعد حاضر ہو گیا۔ شیخ صاحب کہنے لگے کہ اشتہارات کا شعبہ بھی تمہاری تحویل میں دے دیا گیا ہے۔ اس کو بھی سنبھالو۔ چنانچہ میں بھاگا ہوا گیا اور اشتہارات کا شعبہ جو کسی سے نہیں سنبھلتا تھا اس کو فوراً سنبھال لیا۔ ابھی مجھے اس تیز رفتار شعبے کو قابو کئے تیسرا روز تھا کہ قریشی صاحب ہمارے کمرے میں آئے جس کے ایک جانب سرکولیشن مینیجر شیخ محمد احمد اور ان کے ساتھ جنرل مینیجر فاروق احمد بیٹھے تھے جب کہ ایک کونہ شعبہ اشتہارات کی تحویل میں تھا۔ اس وقت فاروق صاحب کہیں گئے ہوئے تھے۔ آتے ہی مجھے کہنے لگے کیوں بھئی "اے بی سی" کا کام کب ختم ہو گا؟ میں نے دست بستہ عرض کی، جناب یہ کام شروع ہو گا تب ختم ہونے کا سوال پیدا ہو گا۔ کہنے لگا کیا مطلب؟ ان دنوں کی تنخواہ آپ کو وصول کرنے کا کیا حق ہے۔ میں نے انہیں بتایا کہ میں شعبہ اشتہارات میں بھی کام کر رہا ہوں نیز یہ کہ متعلقہ ریکارڈ مجھے دیا جائے۔ تاکہ کام شروع کیا جا سکے۔ کہنے لگے فاروق کدھر ہے؟

ایک ہفتہ مزید گزر گیا۔ میں نے شعبہ اشتہارات کا تمام ریکارڈ مکمل کیا۔ پارٹیوں سے خط و کتابت کا آغاز کیا۔ بل جو آج تک کسی نے نہیں بھجوائے تھے وہ بھجوائے گئے۔ لیکن "اے بی سی" کے لئے ریکارڈ نہ ملنا تھا، نہ ملا۔ قریشی صاحب جب بھی ملتے عجیب لہجے میں جو اکثر اوقات تلخ اور ناقابل فہم ہوتا "اے بی سی" کا پوچھتے رہتے بالآخر چوبیس روز کی ناقابل برداشت "بک بک اور جھک جھک" کے بعد ان دنوں کی تنخواہ یا معاوضہ لئے بغیر ہی میں روزنامہ "صداقت" کی سیڑھیاں نیچے اتر آیا۔ اس واقعہ کے چند ماہ بعد مجھے پتہ چلا کہ بے چارے مرنجاں مرنج شیخ سعید الدین احمد انتقال فرما گئے ہیں۔ "انا للہ وانا الیہ راجعون"۔

یہ مجھے پتہ نہیں چل سکا کہ روزنامہ "صداقت" میں انہوں نے جتنے مہینے کام کیا اس کی تنخواہ وہ لے گئے یا نہیں۔

شیخ شفاعت

شیخ شفاعت اگر مشرقی پاکستان کا نام بھی "مغربی پاکستان" رکھ دیتے تو وہ کبھی ہاتھ سے نہ جاتا۔ شیخ صاحب پہلے اخبار نویس ہیں۔ جنہوں نے اپنے اخبار کو خالصتاً "کاروباری انداز سے شروع کیا تھا بعد ازاں ان کی یہ سوچ اور فکر اخبارات کے مالکان اور انتظامیہ نے اپنا کر ثابت کر دیا کہ شیخ صاحب کی نگاہیں واقعتاً" دور رس ہیں

شیخ شفاعت اپنی ذات میں انجمن ہیں۔ کئی لطیفے ان کی ذات کے گرد گھومتے ہیں۔ ایک روز انہوں نے ایک پارٹی کو جس سے انہوں نے اخبار کا کچھ کام کروایا ہوا تھا۔ سات سو یا آٹھ سو کا چیک دیا۔ پارٹی نے کہا کہ شیخ صاحب کل جمعہ ہے پیسے بینک سے نہیں ملیں گے۔ جب کہ کیش کی ازحد ضرورت ہے کچھ دیر سوچ بچار کے بعد کہنے لگے

پیسے میں دے دیتا ہوں۔ مگر بیس روپے کمیشن وضع ہو گی!

پاکستان کا واحد اخبار نویس ہے جو بیک وقت کئی اضلاع سے اپنے روزنامے کو "محدود" وسائل سے کنٹرول کرنے میں ہر طرح سے کامیاب ہے۔ اس کا کریڈٹ بہر حال شیخ شفاعت کو جاتا ہے کہ وہ بہت کم مصارف سے ایک بہت بڑا کام کئے جا رہا ہے۔

صادق قریشی

آج سے ۲۵ برس بیشتر ترقیِ دیہات کا پروگرام ملک بھر میں زور شور سے جاری تھا۔ صادق قریشی صاحب اس محکمے میں بہت اہم اور کلیدی عہدے پر فائز تھے۔ انہی دنوں انہوں نے ملکی صحافتی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کیا یعنی ایک نہایت دبدبہ زیب بلند پایہ پندرہ روزہ "ہم لوگ" پٹیالہ ہاؤس سے جوان کا دفتر تھا شائع کیا۔ صادق قریشی اس کے منتظم اعلےٰ اور چیف ایڈیٹر تھے جب کہ ناصر کاظمی اس کے ایڈیٹر اور حفیظ سرور کارٹونسٹ تھے۔ میں نے اس خوب صورت پرچے کے لیے لکھنا شروع کیا۔ یہ واحد پرچہ تھا جس نے نگارشات اور محنت کا معاوضہ دینے کا التزام کیا تھا۔ چنانچہ نصیر احمد صحرائی جو اس دفتر کے "وزیر خزانہ" تھے مجھے باقاعدہ منی آرڈر کے ذریعے میرے مضامین کا معاوضہ بھجواتے تھے۔ اس زمانے میں پندرہ بیس روپے اچھی خاصی اور معقول رقم تھی۔

ایک روز مجھے ناصر کاظمی کی چٹھی ملی۔ کہ میرا مضمون "حُقّہ" انہیں اور دفتر کے دیگر احباب کو بہت پسند آیا ہے۔ اور یہ کہ میں وقت نکال کر اِن سے ملوں۔ چنانچہ میں پٹیالہ ہاؤس میں فرداً فرداً سب حضرات سے ملا۔ ناصر کاظمی مجھے ہمراہ لئے صادق قریشی صاحب کے کمرے میں گئے اور ان سے میرا تعارف کرایا۔

قریشی صاحب کا یہ کمرہ ان کے جسم اور چہرے کی مانند بھرا بھرا اور پُرشان تھا۔ انہوں نے مجھ سے محض رسماً ہی گفتگو نہ کی بلکہ میری حوصلہ افزائی کرنے کے لئے باقاعدہ تعریفی و تحسینی کلمات کہے اور مجھے چند مفید مشورے بھی دیے۔ بعد ازاں ناصر کاظمی اپنے کمرے میں آئے اور مجھ سے پُوچھا کہ اگر میں کام کرنے کے لئے تیار ہوں تو وہ میرے بارے میں قریشی صاحب سے بات چیت کر سکتے ہیں۔ مگر میں ان دنوں اپنے بعض نجی معاملات میں بے حد مصروف تھا اور یوں "ہم لوگ" میں کلیتاً شامل

ہونے سے رہ گیا۔ میں نے "دفتر ہم لوگ ہیں" کے عنوان سے صادق قریشی، ناصر کاظمی اور دیگر احباب سے اس ملاقات کا حال محکمہ ترقی دیہات سے متعلقہ ایک ماہنامہ "رودِ چناب" میں بھجوا دیا۔ جس کی اشاعت کے بعد کاظمی مرحوم نے مجھے ایک اور خط لکھا کہ "تمہاری ڈائری بے حد لطیف اور لذیذ تھی۔ محترم قریشی صاحب بھی اس سے بہت محظوظ ہوئے"۔

صغیر احمد منشی

صغیر چھوٹے کو کہتے ہیں مگر صغیر احمد منشی کو مزید اختصار پسند تھا لہٰذا اس نے اپنے آپ کو ایس اے منشی لکھنا شروع کر دیا ایک روز میرے ذہن میں آیا کہ میں اسے مشورہ دوں کہ وہ منشی کو بھی مزید تخفیف کر کے اسے صرف "شی"، بنا دے مگر اس کے "بلڈ پریشر" سے خوف آ گیا اور میں خاموش ہو رہا منشی صاحب جلالپور جٹاں سے موٹر سائیکل پر جس دوست سے ملنے کے لئے آتے ہیں اکثر اس کے مخالفوں سے مل کر واپس چلے جاتے ہیں غصّے اور مزاج کے بہت تیز ہیں۔ البتہ ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ ان کا بلڈ پریشر جب چلا جاتا ہے تو اس کے اندر سے بڑا ہی مخلص اور باوفا ایس اے منشی نکلتا ہے جو آپ پر اپنی جان تک فدا کرنے کے لئے تیار نظر آئے گا وہ شکل و صورت اور سر کے بالوں سے خالص سوڈانی لگتا ہے جب ہنستا ہے تو پوری تبتیسی سے وہ دانت نمایاں نظر آتے ہیں جن پر سونے کا پانی چڑھا ہوا ہے پورے جسم میں صرف یہی دانت مصنوعی ہیں ورنہ تصنع کا وہ قائل نہیں جو بات اس کے ذہن میں آجاتی ہے۔ جھٹ سے کہہ دیتا ہے۔ بہت سی خوبیوں اور خامیوں کا مرقع ہے کیونکہ انسان اور ابنِ آدم ہے۔

ضمیمہ زمزم

میں اگست ۱۹۴۷ء کو بے سروسامانی کی حالت میں لاہور پہنچا۔ اور کئی روز رتن باغ میں ٹھہرا رہا۔ یہاں سے مجھے میرے چچا عبداللہ خاں اپنے ہمراہ لے کر بھارت نگر میں واقع اس "مکان" میں لے گئے جو چند روز قبل ہی ہنگاموں میں جل کر تباہ ہو چکا تھا۔ اس بڑے سے مکان کا صرف ایک چھوٹا سا کمرہ محفوظ تھا۔ باقی تمام کمروں کی چھتیں آگ سے جلنے کے بعد زمین بوس ہو چکی تھیں، یہاں چچا تو ہر روز بھارت سے آنے والے قافلوں میں وہاں رہ جانے والے عزیزوں اور رشتہ داروں کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور میں جگہ جگہ کیمپوں کا رُخ کر کے ان کو تلاش کرتا اور اکثر گھر سے باہر ہی اِدھر اُدھر پڑا رہتا۔ رسائل وجرائد پڑھنے کا مجھے بچپن سے ہی بے حد شوق تھا۔ میرے ایک عزیز خالد لطیف کے ہاں "تعلیم و تربیت" آیا کرتا تھا۔ جس کے حصول کے لئے میں اس کے گھر کے کئی کئی پھیرے ڈالا کرتا تھا۔ کیمپوں میں چکر لگانے کے علاوہ ایک اخبار فروش سے جو لوہاری کے باہر انارکلی میں بیٹھتا تھا۔ کئی میل روزانہ پیدل مسافت طے کرنے کے بعد روزانہ اخبار حاصل کر کے پڑھا کرتا تھا۔ ایک روز اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا کام کرتا ہوں۔ میں نے اسے بتایا کہ ہندوستان سے آیا ہوں۔ ماں باپ کا ابھی کوئی پتہ نہیں۔ چچا روزانہ اپنے بال بچوں اور عزیزوں کی تلاش میں چلے جاتے ہیں۔ میرا اکیلے میں دل گھبراتا ہے اور یوں میں آوارہ پھرتا ہوں۔ اس نے مجھے اخبار بیچنے کا مشورہ دیا۔ میں نے فوراً حامی بھر لی۔ اس نے مجھے چاندی کا ایک روپیہ دیا جس پر ملکہ یا بادشاہ کی ایک تصویر بنی ہوئی تھی اور کہنے لگا کہ منہ اندھیرے ہسپتال روڈ کے سرے پر واقع گیلانی الیکٹرک پریس پہنچ جاؤں چنانچہ میں صبح چار بجے کڑاکے کی سردی میں گیلانی الیکٹرک پریس چلا گیا۔ جہاں

سڑک کے دونوں طرف ہاکر اخبارات خرید رہے تھے۔ ان دنوں زمیندار، انقلاب نوائے وقت، مغربی پاکستان اور الفضل اخبار یہاں چھپتے تھے۔ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اور "پاکستان ٹائمز" کے اپنے پریس سے تھے تاہم ان سبھی اخبارات کی سیل یہیں ہوتی تھی۔ میں نے اپنے محسن اخبار فروش کی ہدایات کے مطابق چند اخبارات خرید لئے۔ اخبار کی قیمت ان دنوں ایک آنہ تھی جب کہ قیمت فروخت ڈیڑھ آنہ تھا۔ ماڈل ٹاؤن سوسائٹی بس سروس نئی نئی چلی تھی۔ میں نے اخبار لئے اور ایک بس کے کنڈیکٹر کو اخبار تھماتے ہوئے بس میں بلا ٹکٹ سوار ہو گیا۔ دو چار اخبار بس میں فروخت ہوتے بعد ازاں میں ماڈل ٹاؤن میں اُتر گیا۔ ان دنوں اخبار بیچنے کے لئے منہ سے آواز نکالنا ضروری تھا۔ بس کے اندر تو لوگوں کو دکھا دکھا کر کام بن گیا تھا مگر ماڈل ٹاؤن میں جہاں وسیع و عریض بنگلوں کے اندر مکین آباد تھے "آج کا تازہ اخبار" کہنا ازبس ضروری تھا۔ ابتداء میں آواز گلے کے اندر ہی دب گئی۔ بالآخر کوشش جاری رکھنے کے نتیجے میں دو گھنٹوں کے بعد سترہ اخبارات فروخت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ پانچ چھ باقی بچنے والے اخبارات میں نے لوہاری پہنچ کر اخبار فروش کے سپرد کر دیئے اس نے حساب کتاب کرنے کے بعد مجھے بتایا کہ میں نے تین آنے کمائے ہیں۔ چنانچہ اگلے روز میرا سرمایہ ایک روپیہ تین آنے تھا۔ دوسرے روز میرا منافع تیرہ آنے دو پیسے تھا۔ دس روز کے بعد ایک روپیہ واپس کرنے کے باوجود میری جیب میں ساڑھے تین روپے تھے جب کہ میں دو ٹائم ڈیڑھ آنے کی روٹی بھی قیمتاً کھاتا تھا۔ ایک روز شام کے چار بجے میں نے مال روڈ پر ایک ہاکر کے کہنے میں آ کر اس سے "سنڈے سٹیٹسمین" کی بارہ کاپیاں خریدیں جو غالباً کلکتہ سے آتا تھا۔ شام کا وقت تھا میں بمشکل دو تین اخبار بیچنے میں کامیاب ہوا۔ بعد ازاں میں اپنے محسن کے پاس لوہاری چلا آیا اور اسے بتایا کہ میرا آج کا منافع یہ اخبار کھا گیا ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے نصیحت کی کہ دیکھو اگر شام کا اخبار بیچنا ہی ہے تو "ضمیمہ زمزم" بیچا کرو۔ چنانچہ میں صبح کے اخبارات فروخت کرنے کے بعد شام کو "ضمیمہ زمزم" بھی بیچنے لگا۔ اس ضمیمے کا دفتر کراؤن بس کے اڈے کی گھاٹی

کے اتار پر فلیمنگ روڈ پر واقع تھا۔ یہ ضمیمہ دو پیسے کا ملتا تھا جب کہ ہم اسے ایک آنے میں فروخت کیا کرتے تھے۔ ایک روز تمام ہاکروں نے فیصلہ کیا کہ آج ضمیمہ بالکل مفت حاصل کیا جائے گا۔ خدا جانے اس فیصلے کی کیا وجوہ تھیں۔ بہر حال مالکان کو یہ مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ منتظمین ضمیمے کو تانگے میں لاد کر موچی گیٹ کے باغ میں لے گئے۔ ہاکروں نے تانگے پر دھاوا بول دیا۔ میں نے دیکھا کہ اگر میں اس طوفان کی زد میں آ گیا تو ہڈی پسلی بچانی مشکل ہو جائے گی۔ چنانچہ ایک جانب کھڑے ہو کر تماشائی بن کر رہ گیا کیا دیکھتا ہوں کہ ایک ہاکر ضمیمے کی کوئی ساٹھ ستر کاپیاں اپنی بغل میں دبانے کے بعد مزید کاپیاں کھینچنے کی جد و جہد کر رہا ہے میں نے پھرتی سے چھلانگ لگائی اور اس کے بغل والے بنڈل کو پوری طاقت سے اپنے دونوں ہاتھوں سے کھینچ لیا۔ اس کوشش میں دس بارہ اخبار پھٹ گئے۔ لیکن میں نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور وہاں سے سرپٹ بھاگنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس روز بمشکل ضمیمے مقررہ قیمت یعنی ایک آنے میں فروخت کئے۔ بارہ دو دو پیسے میں، پندرہ ایک ایک پیسے میں اور باقی چھ سات ردّی کے طور پر صرف دو پیسے میں فروخت کئے۔ اخبار فروشی کی اس تجارت کا یہ فائدہ ہوا کہ جب میری والدہ محترمہ لاہور پہنچتے ہی رحلت فرما گئیں اور سب سے چھوٹے بھائی جس کی عمر صرف بیس بائیس روز تھی۔ نیز اس سے بڑے دو تین شیر خوار بہن بھائیوں کے لئے خشک ڈبے کا دودھ ناگزیر بنا یا گیا اور ابا کی جیب خالی تھی۔ تو میری محنت سے کمائے ہوئے یہ پیسے بہت کام آئے مجھے آج بے حد افسوس ہوتا ہے جب مجھے یہ یاد آتا ہے کہ پانچ چھ ماہ کے بعد مجھے اس کام سے اٹھا کر پھر سے سکول میں داخل کروا دیا گیا تاکہ میں بھی پڑھ لکھ کر کاغذی ڈگریاں لے کر بے روزگاروں، سراسیمہ کلرکوں اور ملک کے بھوکوں ننگوں، مفلسوں اور قلاشوں میں اضافہ کا موجب بن سکوں۔ اے کاش اگر میں اس کام کو جاری رکھتا

تو یقیناً اخبار فروش یونین کا بانی رکن ہوتا۔ بطور اجارہ دار اخبار فروش کی حیثیت سے لاہور کے کسی وسیع و عریض علاقے پر قابض ہوتا۔ گھر بیٹھے بٹھائے ہزاروں روپے کی آمدنی ہوتی اور میں مزے سے بیٹھا تاش کھیلتا۔ اخبارات کے مالکان اور منتظمین مجھ سے خوف کھاتے اور میرے اعزاز میں دعوتیں اور عصرانے دیتے"

ضیاء الدین

صوفی منش لوگ کئی دیکھے ہیں۔ مگر ضیاء الدین ان میں سے عجیب ترین ہیں شاید "ندائے ملّت" میں ہمارے قافلے میں شامل ہُوا تھا۔ میں نے اُسے پہلی نظر میں ہی تاڑ لیا کہ انتہائی متوکل اور صابر انسان ہے۔ سیڑھیاں چڑھنا اس کے لئے بے حد مُشکل ہے۔ دو تین منزلہ عمارت پر جانے کے لئے بے چارہ دو تین بار راستے میں رُک کر اپنی سانس درست کرتا ہے مگر اپنی دُھن کا بہت پکا اور محنتی آدمی ہے۔ کبھی گردشِ زمانہ یا آفات و مصائب کا رونا نہیں روتا۔ راضی بہ رضا رہتا ہے میں اکثر سوچتا ہوں کہ ایسے بے ضرر مگر مفید عام وجود کو کچھ لوگ تنگ کیوں کرتے ہیں۔ شاید وہ یہ نہیں جانتے کہ آہِ غریب و مسکین عرش سے بھی کہیں زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ضیاء الدین جیسا درویش صفت اس قسم کی آہ لینے سے ہی گھبراتا ہو *

سید ضیاء اللہ شاہ بخاری

ضیاء اللہ شاہ بخاری، علامہ عنایت اللہ شاہ بخاری کے فرزند ارجمند ہیں۔ وہ علمائے دین متین جنہیں علم و فضل و حکمت کے ساتھ ساتھ نورانی اور روشن چہرے بھی نصیب ہوئے ہیں۔ ضیاء اللہ شاہ ان کی صفِ اول میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ تقریر و تحریر دونوں میں یکساں قدرت رکھتے ہیں اور اپنے تبحرِ علمی کا لوہا منوانے میں ہر طرح کامیاب و کامراں ہیں۔ شہر کی سب سے بڑی اور خوب صورت جامع مسجد میں جمعہ کی نماز پڑھاتے ہیں اور رمضان المبارک میں باقاعدہ تراویح کی نماز پڑھانے کے لئے اپنی جامع مسجد سے کافی مسافت پر واقع کسی نہ کسی مسجد میں اپنے مریدین کے عین درمیان میں باوقار طریقے سے چلتے ہوتے جاتے ہیں۔ راستے میں کوئی شناسا مل جاتے تو اپنی عادت کے مطابق مسکرا کر اس سے مصافحہ اور اگر ضرورت سمجھیں تو معانقہ فرماتے ہیں۔ حال احوال دریافت کرتے ہیں جب کہ ان کے کھدّر پوش سادہ سادہ سے مرید عجیب و غریب نظروں سے شاہ صاحب کے اس شناسا چہرے کو بغور گھورتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالٰے نے ان کے لئے رزق کے وافر سامان کر رکھے ہیں۔ جس میں سے وہ قرآنی احکامات پر عمل کرتے ہوتے تمام شراکت داروں کا بشمول "ابن السبیل" حصہ نکالتے ہیں۔ ان کی گفتگو میں انکساری اور تواضع مخاطب کے ظرف سے بھی بڑھ کر ہوتی ہے۔ محض خشک تقریر ہی کرنا نہیں جانتے۔ بلکہ محفل کے مزاج اور اس کی ضرورت کے مطابق شگفتہ پیرایہ بھی خوب استعمال کرتے ہیں جامع مسجد کے دینی مدرسے میں زیر تعلیم طلبہ ہی کو نہیں بلکہ اکثر دوسرے دوستوں کو بھی شریکِ طعام کرکے ان کے لقموں کا ثواب حاصل کرتے ہیں۔ عالم باعمل ہیں۔ اچھے دوست، خطیب اور مشیر ہیں۔

طارق عزیز

کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ اگر تم کسی نہ کسی طرح اپنی کتاب طارق عزیز تک پہنچا دو تو بس سمجھو کہ کام بن گیا۔ ان کی اس رائے سے مجھے ازحد مسرت ہوئی کہ طارق عزیز اپنی محنت کے طفیل آج اس مقام تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا ہے جہاں وہ کسی کا بیڑا پار لگانے یا اس کا بیڑہ بٹھانے پر پوری طرح قادر ہے ورنہ یہ وہی طارق عزیز ہے۔ جو جب گردش زمانہ کا شکار تھا تو لوگ اس کی حالت پر ہنسا کرتے تھے۔ اور شاید ہی کبھی کسی کو یہ توفیق ملی ہو کہ وہ دکھ درد میں اس کا شریک بنا ہو۔ اخباروں میں، فلموں میں، ٹی وی میں، خدا جانے کہاں کہاں ویرانوں، صحراؤں اور گلشن گلشن بکھرنے کے بعد طارق عزیز کہیں جا کر آج سب مطلبی اور خود غرض حضرات کی آنکھ کا تارا بن گیا ہے۔ سچ ہے ؎

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا
سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

طالب جالندھری

طالب جالندھری پنجاب کا معروف ہی نہیں مقبول شاعر ہے جس کو یہ سعادت نصیب ہوئی کہ اس نے تحریکِ پاکستان میں بھی نمایاں حصہ لیا اور ایسے نغمے تحریر کیے جن کو گھر گھر سُنا گیا اور گایا گیا۔ اس کا ایک گیت جس کو حصولِ پاکستان کا گیت کہنا چاہیے۔ پاکستان کے جنم لینے سے کچھ عرصہ قبل تک پنجاب کے مسلمانوں کو حفظ تھا۔ اس کے بول یوُں تھے۔

پاکستان پاکستان پاکستان
پاکستان لینوں کیہڑا سانوں روک سکدا
ہر کوئی اپنے گھراں دے اتے حق رکھدا
اسے کریئے اعلان ساڈی جند ساڈی جان
پاکستان پاکستان پاکستان
تینوں یاد ہسپانیہ دی یاد ہووے گی
اوسے طراں تیری ہستی وی برباد ہووے گی
جے توں کھو بیٹھا ہتھوں مسلم اُپنا جہان
پاکستان پاکستان پاکستان

اس کا ایک دوسرا گیت جسے اس زمانے میں مسلم نوجوان گلی کوچوں میں گاتے پھرتے تھے۔ یہ تھا۔

نعرہ پاکستان والا مومناں لگائی چل
سُتی ہوئی خواب وچ قوم نوں جگائی چل

حنجر ہلال اُچا رکھناں نشان نوں
ہو کے آزاد رہنا دس دے جہان نوں
فیر اسلام دی دکھایئے آن بان نوں
منزلاں نیں کول کول قدم ودھائی چل
نعرہ پاکستان والا مومناں لگائی چل

طالب کے گیت نورجہاں کے علاوہ ماجھے کے ٹھیٹھ اور سُندر ربیعے بال پنجاب کی خواتین کی مشہور جوڑی پرکاش کور اور سریندر کور نے بھی گائے ہیں ان میں سے ایک گیت نورجہاں اور اس کے بعد ان کوروں نے بھی گایا ہے۔ پنجاب کے دیہات میں ذوق و شوق سے سُنا جاتا ہے۔ ماضی میں ریڈیو کو پنجابی کے جن گیتوں کی فرمائش ہوتی تھی۔ ان میں یہ سرفہرست ہوتا تھا کہا جاتا ہے کہ اب بھی عوام اس مقبول گیت کی فرمائش کرتے ہیں مگر نامعلوم وجوہ کی بناء پر اب طالب جالندھری کے گیت نشر نہیں ہوتے شاید اس کے ریکارڈ تھک گئے ہیں یا گھِس گئے ہیں وہ مقبول گیت یہ ہے

تیرے باجرے دی راکھی
اڑیا میں نہ بہندی وے، ماہیا میں نہ بہندی وے

کاں کاں لاتی کالیاں کاواں
دے میں کدھر کدھر جاواں
جے میں سیٹی مار اڈاواں
میری سُرخی لہندی وے
تیرے باجرے دی راکھی اڑیا میں نہ بہندی وے
پنچھی آوندے بنھ بنھ ڈاراں آکے بہندے لکھ ہزاراں
جے میں نوڑی مار اڈاواں میری مہندی لہندی وے
تیرے باجرے دی راکھی اڑیا میں نہ بہندی وے

باجرا تیرا پنچھی کھاوندے
مینوں کلیاں ویکھ ستاوندے
جے میں اڈی مار اڈاواں
جھانجھر ڈگ ڈگ پیندی وے
تیرے باجرے دی راکھی اڑیا میں نہ بہندی وے

آجا دونویں راکھی بہیے
نالے لٹ بہاراں لیئے
تیرے ایداں چن وچھوڑے
میری جند نہ سہندی وے
تیرے باجرے دی راکھی اڑیا میں نہ بہندی وے

مقبول گلوکارہ فریدہ خانم نے بھی طالب جالندھری کا ایک گیت نہایت خوبصورت لہجے میں گایا ہے۔

ساڈی سجناں یاد بھلا کے
کیہڑا وے تو رب ہو گیئوں
اگ کھڑیاں پھلاں نوں لا کے
کیہڑا وے تو رب ہو گیئوں
سدھراں سا...ں لے گیوں کھو کے
نین گنواں لئے میں رو رو کے
جند ہنجواں دے وس پا کے
کیہڑا وے تو رب ہو گیئوں ساڈی سجناں یاد بھلا کے...

دس نا تیرے دل کی آئیاں
لائے بول نہ توڑ نبھائیاں
ایویں جھوٹھیاں قسماں کھا کے
کیہڑا وے توں رب ہو گیئوں
ساڈی سجناں یاد بھلا کے کیہڑا وے توں رب ہو گیئوں، اگ کھڑیاں پھلاں نوں لا کے:

طالب جالندھری کا ایک اور گیت جو مذکورہ بالا دو گیتوں کی مانند مجھے بے حد پسند ہے نہ یوں ہے ؎

امبی ہیٹھ محرماں وے ہیں تاں کدے دی کھڑی
تیری ساک ساجناں وے تیری تانگ وے بڑی

بولے امبی اُتے کوئل
پنچھی کر دے کلول
ساڈا جیا گیا ڈول
ایویں جندڑی نہ رول
چھڈ اڑی ظالماں وے
آجا گھڑی دی گھڑی
امبی ہیٹھ محرماں وے ہیں تاں کدے دی کھڑی :

چڑھ ہیٹ ساون دا مہینہ
ساڈا تپدا اے سینہ
تیرے باہجوں کاہدا جینا
توں ایں دل دا نگینہ
میری جند جانیاں وے
تیرے وعدیاں بھچڑی

امبی ہیٹھ ظالماں وے ہیں تاں کدے دی کھڑی
سانوں لگیاں اڈیکاں تینوں کھبیاں تریکاں
کیہڑے پھالیاں شریکاں لاویں عشق نوں لیکاں
توں نہ آیوں رانجھنا وے لائی ہنجواں جھڑی
امبی ہیٹھ محرماں وے ہیں تاں کدے دی کھڑی

تحریک پاکستان کے بعض دیگر نامور کارکنوں کی مانند آج طالب جالندھری بھی کبھی فراموش کردہ۔ کی جنوں خیز کہانی بن کر اپنا لبتہ بغل میں دابے سوہنے شہر لاہور کی مصروف ترین کاروباری شاہراہوں پر یوں پھر رہا ہوتا ہے جیسے کوئی گواچی ہوئی گاں، یا کسی بے آب وگیاہ وادی کی فضاؤں میں کوئی زخم خوردہ شاہین۔

ظہور عالم شہید

بابا ظہور عالم شہید کسی زمانے میں اس ایڈیٹوریل بورڈ کے تھم تھے۔ جس کے دوسرے رکن گرامی بشیر احمد ارشد تھے۔ ارشد صاحب تو جہاں تھے وہیں جم کر رہ گئے مگر ظہور عالم شہید ہو کر "جاوداں" ہو گئے۔ کچھ عرصہ ایک ہفت روزہ بھی ایڈٹ کرتے رہے اور پھر ایک عرصہ تک عالم برزخ میں بسر کر کے صداقت میں جا ڈیرا ڈالا۔

نیوز کے باب میں شہید صاحب سے بہتر ایڈیٹر بہت کم ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی حیثیت مستند ہے۔ سوشل لائف میں بے حد ملنسار اور شفیق ہیں۔ بس ایک بات ہے کہ بہت ڈھلمل طریقے سے مالکان کے روبرو اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے ساتھ کام کرنے والے ماتحت ایڈیٹر اور عملہ ہمیشہ نقصان میں رہتا ہے مگر شہید صاحب کی ذاتی شرافت، محبت اور خلوص ان کو مہر بہ لب کر دیتا ہے اور وہ بے چارے "شر" اور "آفت" کی چکی میں پستے رہنے کو ہی اپنا مقدر جاننے لگتے ہیں۔

"بندے دیا پتر!" شہید صاحب کا وہ کوڈ ورڈ ہے جو اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مخاطب ان کا بے حد عزیز اور قریبی ہے۔ چنانچہ ان کے ماتحت عملہ میں سے جسے یہ ٹائٹل نصیب ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی خوش بختی پر نازاں ہونے لگتا ہے ان بیچاروں کو یہ علم ہی نہیں ہوتا کہ شہید صاحب نے ان میں سے ہر ایک کو یہ محبت بھرا ٹائٹل الاٹ کر رکھا ہے۔

عثمان علی خان

"امروز" کے دفتر میں یوں تو کئی شناسا چہرے ہیں جن میں حمید جہلمی، تاج الدین حقیقت، وحید عثمانی وغیرہم شامل ہیں۔ جناب ہارون سعد سے بھی کچھ ملاقات ہے اور میں نے ان کا گھر بھی دیکھا ہوا ہے۔ لیکن جس بزرگ دوست کی کشش مجھے وہاں جانے پر مجبور کر دیتی تھی وہ عثمان علی خان ہے جن سے حسب معمول ملنے کے لئے گزشتہ روز ان کے کمرے میں گیا اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جو ان کی میز کے ساتھ ملاقاتیوں کے لئے مخصوص ہے اور جس پر بیٹھ کر میں نے ہمیشہ محسوس کیا کہ اس میں بھی خاں صاحب کی شفقت و محبت بسی ہوئی ہے۔ مگر اس روز اس کرسی سے مجھے غیریت اور اجنبیت کی ناقابل فہم بو سی آئی ابھی میں اس حیران کن تبدیلی کے بارے میں غور و فکر کر رہا تھا کہ کمرے کے ایک کونے سے مجھے خاں صاحب کی آواز آئی "نعیم صاحب! ادھر آجائیں"۔ میں مجسم سوال بن کر ان کے سامنے گیا تو انہوں نے بتایا کہ جولائی میں ریٹائرمنٹ کے بعد ادارے نے انہیں دوبارہ ایک سال کے لئے جو ملازمت دی تھی وہ کئی روز پہلے ختم کی جا چکی ہے آج وہ محض اتفاقاً اخباروں کی فائل دیکھنے کے لئے وہاں آئے ہیں۔

خاں صاحب کے ان جملوں سے میں نے یہ محسوس کیا کہ اس ادارے سے وہ ریٹائر نہیں ہوئے بلکہ میں آج ریٹائر ہوا ہوں اور یہ سوچ کر میرے سامنے میرے

بیوی بچے مفلوک الحال شکل میں قطار در قطار آ کھڑے ہوئے

عثمان علی خان ایک شخصیت کا نام نہیں وہ تو ہماری اس مشرقی تہذیب کا

نمائندہ ہے جو مُدّت ہوئی ہمارے معاشرے سے ریٹائر ہو چکی ہے۔ لہٰذا اُس کی ریٹائرمنٹ پر مجھے چنداں تعجب نہیں ہوا۔ البتہ دُکھ اس بات کا ہے کہ اب امروز کے دفتر میں مجھ جیسے سرپھرے، بے کار اور گردشِ دوراں کے اسیر انسانوں سے کون میٹھے بول بولے گا۔ کون ڈھارس بندھائے گا۔ کون علم و حکمت کی باتیں کرے گا اور کون بھاگ کر جائے گا اور گرم گرم چائے خود لاکر پلائے گا۔

خان صاحب کی اس ریٹائرمنٹ کا دُکھ بہُت سے لوگوں کو ہوگا۔ جن میں لوگوں کے دلوں پہ لگے قفل کھولنے والے اور امامت و جمعہ کے بارے میں اخبارات میں مسلسل اشتہار دینے والے بزرگ غلام محمد کوچہ تیزاب احاطہ بھی شامل ہیں جو اکثر مجھے خاں صاحب کے پاس بیٹھے ہوئے نظر آیا کرتے اور دقیق علمی مضامین پر تبادلہ خیالات کیا کرتے تھے ۞

ایبٹ روڈ

پر ایک موٹا تازہ سُرخ قندھاری انار جیسا پٹھان رات گئے تک نگینے اور انگوٹھیاں بیچتا ہے۔ رات گیارہ بجے کے بعد یہ عظیم خاں رکشہ چلاتا ہے۔ صبح خرادیے کا کام کرتا ہے۔ خدا جانے سوتا کب ہے۔ چلتا پھرتا جنّ ہے۔ ایک بہُت بڑے آدمی کا بہُت بڑا بیٹا ہے۔ اپنے گھر والوں سے روپے پیسے کی بھیک مانگنی اس کے نزدیک بزدلی اور کمینگی ہے لہٰذا وہ شب و روز محنت کرتا ہے۔ خوب کماتا ہے اور خوب کھاتا ہے۔ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتا ہے۔ گاہک کو دور سے دیکھ کر اندازہ کر لیتا ہے کہ اس کی جیب میں کتنے پیسے ہیں اور اسے کونسی چیز درکار ہے۔ اچھا دوست اور عمدہ انسان ہی نہیں عظیم ماہر نفسیات بھی ہے

عطاء الحق قاسمی

کچھ دوستوں کا کہنا ہے کہ معاصر چھاپنے کے بعد قاسمی اَب بڑا آدمی بن گیا ہے حالانکہ وہ اس سے بہُت پہلے کا بڑا بن گیا ہوا ہے۔ اور اب تو وہ ماشاءاللہ دو تین بچوں کا باپ بھی ہے۔ تاہم قدرتی امر ہے کہ آج سے پندرہ برس قبل جب وہ نوائے وقت میں میرا کولیگ ہوتا تھا۔ آج سے کہیں چھوٹا تھا۔ چھوٹے سے بڑے بننے کی اس درمیانی مدت میں وہ دو تین بار مجھے ملا اور اس نے مجھے پہچان لیا جس سے میں نے یہ جانا کہ "روزنِ دیوار" سے وہ فرش پر لیٹے ہوئے ساتھیوں کو ابھی دیکھ سکتا ہے

ایک ایسی ہی ملاقات میں جب اس نے یہ بتایا کہ اس کا بیٹا ابھی سے قافیے کو ہم وزن کرنے لگا ہے تو دل ہی دِل میں اس کے لئے دُعا نکلی کہ یا اللہ اسے بھی اس کے باپ کی طرح قسِمت کا دھنی بنانا۔ ورنہ شاعر بنانے سے کہیں بہتر ہے کہ اسے حکیم بنا دینا کہ اس میں نسخے کو ہم وزن کرنے کے بعد اس کا ٹھرک بھی پورا ہو جاتے گا اور وہ کئی شاعروں اور ادیبوں کی مانند بھوکا بھی نہیں رہے گا۔

سیّد عطاء اللہ شاہ بخاریؒ

شاہ جی پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جائے گا میں ان کے صرف ان اوصاف کا تذکرہ کروں گا جن کی مجھے ذاتی طور پر آگاہی ہے۔

ہزاروں لاکھوں افراد کے مجمعے کو کنٹرول کرنا شاہ جی پر ختم تھا۔ وہ جب چاہتے حاضرین کو ہنسا دیتے۔ جب چاہے رُلا دیتے۔ بُلا لیتے، بھگا دیتے، اٹھا دیتے بٹھا دیتے۔ اُٹھا دیتے اور بچھا دیتے۔ قرآن کی تلاوت وُہ یُوں کرتے کہ قرأت کے ساتھ ساتھ لفظوں میں گلاب اور صندل کی خوشبوئیں آتیں۔ انسان تو کیا چرند پرند جمادات، حیوانات سب وجد میں آ جاتے۔ اپنی غلطی کو محسوس کرنے کے بعد اس کا واشگاف اظہار کرنے اور عام بڑے لوگوں کے بالکل برعکس اپنی بات پر اڑے نہ رہتے۔ نجی محفلوں میں اپنے مخالفین کی خوبیوں کا برملا اعتراف کرتے اور کسی مصلحت کو آڑے نہ آنے دیتے۔

بہترین مقرر اور بے مثل خطیب تھے، ادیب تھے اور لوگوں کی دھڑکنوں کے بے حد قریب تھے۔ مگر جب ان پر آخری وقت آیا تو وہی لوگ جو اِن کی تقریروں سے دِلوں کو گرمایا کرتے تھے پُرسے کے لئے بھی انھوں نے فرصت نکالنے کی سعی نہ کی اور شاہ جی کی پیشین گوئی کو حرف بحرف سچ ثابت کر دیا ؟

علامہ عنایت اللہ مشرقی

علامہ عنایت اللہ مشرقی کی علمی ادبی شخصیت ہنگامہ خیزیوں اور ہنگامہ پروریوں سے عبارت ہے۔ ان کی سیاست اور مسلم لیگ سے اختلاف کو قطع نظر کرتے ہوئے اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں کوئی مصلحت آڑے نہیں آتی۔ کہ طویل عرصے تک انگریزوں کی غلامی اور اپنے قومی ورثے سے روگردانی اختیار کرنے والے برصغیر کے مسلمان جب انتہائی ذہنی، سماجی، سیاسی اور اقتصادی پستی کا شکار تھے اور جب اغیار کو یہ یقین کامل ہو رہا تھا کہ اب مسلمان سر اٹھا کر چلنے کی سکت سے عاری ہو چکے ہیں۔ ان دنوں علامہ عنایت اللہ مشرقی نے مسلمانوں میں ایک ایسی عسکری تنظیم قائم کی۔ جس کی "چپ راست" بیلچوں، وردی اور بے مثال نظم و ضبط نے ہندوؤں، انگریزوں اور سکھوں کے ایوانوں میں لرزہ طاری کیا اور مسلمانوں میں بہ حیثیت مجموعی وہ جذبہ شاہین و اسد بیدار کیا جو صدیوں سے خفتہ تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ کی فکر اور سوچ سے اختلاف کیا گیا اور ان کی قائم کردہ تنظیم، وقت گزرنے کے ساتھ محض ایک علامتی ٹائیٹل بن کر رہ گئی۔ لیکن اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں سیاسی بیداری کی جس لہر نے تحریک پاکستان کو جنم دیا اور جو بالآخر قیامِ پاکستان پر فتح یاب ہوئی۔ اس میں براہِ راست نہ سہی۔ بالواسطہ طور پر علامہ کی ناقابلِ فراموش کوششوں کا واضح عمل دخل ہے۔ دراصل علامہ عنایت اللہ مشرقی

کی مثال جھلسا دینے والی گرم دوپہر میں یکایک آسمان پر چھا جانے والے بادلوں کی اس رعد اور برق سے دی جا سکتی ہے۔ جو راہِ حق میں حائل ہونے والوں پر کپکپی طاری کر دیتی ہے جب کہ خزاں رسیدہ کلیوں اور پھولوں کو انہی بادلوں کے طفیل حیاتِ نو ملتی ہے اور وہ خوشی سے جھومنے اور لہلہانے لگتے ہیں۔ فطرت کا مطالعہ ثابت کرتا ہے کہ وہ فصلیں جو موسلا دھار بارش کے کئی ماہ بعد حاصل ہوتی ہیں۔ ان کا کریڈٹ اِن بادلوں اور بجلیوں کو بھی جاتا ہے جو عین وقت پر گرجنے کے بعد مطلع صاف اور زمین ہموار کر گئیں ٭

فضل کی کنٹین

پی آئی اے کے دفتر کے اوپر شاہ دین بلڈنگ میں فضل کی کنٹین ہے جس کا وصف یہ ہے کہ ہم بے کار ہوں یا باکار۔ اس کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ چائے پئیں۔ کھانا کھائیں۔ سلام دعا لے کر چلتے بنیں گے۔ فضل بھائی زیادہ سے زیادہ کاپی پر حساب کتاب لکھ لے گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ دو چار ماہ کے بعد جب کبھی ادھر سے گزر ہو گا اگر جیب میں پیسے ہوں گے تو سابقہ اور لاحقہ رقم اس کو دے دی جائے گی۔ اور اگر پھر وہی بھوک کی نیم جانی ہو گی تو فضل کی کنٹین ہو گی۔ ہم ہوں گے اور زیادہ سے زیادہ اس کی کاپی ہو گی۔ مزے سے کھائیں پئیں گے اور قبل ازیں جو سیڑھیاں ہم گن گن کر اُوپر گئے ہوں گے ان کو زقندیں بھرتے ہوئے طے کر کے نیچے اتر آئیں گے اور شاہراہ قائدِاعظم کے انبوہ کثیر حسین و جمیل میں شامل ہو کر اسے گدلا کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جائیں گے۔ اس کنٹین کی ایک اور خوبی ہے کہ خدانخواستہ اگر وہاں کھانا ختم بھی ہو گیا ہو تو صرف کرسی پر بیٹھ کر حسینانِ جہاں اور کاروں کی نہ ختم ہونے والی قطار دیکھ کر ہی طبیعت خوش ہو جاتی ہے کہ ہم اور ہمارا ملک کسی سے کم نہیں ہے

فلاں تھرو پیک

ملک رفیق رہنے والا تو بدو ملہی ضلع سیالکوٹ کا تھا۔ مگر اس کی دوکان بیڈن روڈ پر تھی جہاں وہ ریڈیو، ٹی وی کی مرمت کا کام کرتا تھا۔ جس میں وہ بہت مہارت رکھتا تھا لیکن ایک نقص جو اکثر فنکاروں، آرٹسٹوں اور ٹیکنیشنوں میں پایا جاتا ہے اس میں بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ یعنی دن میں جتنے بھی ریڈیو مرمت کے لئے آتے تھے سب کے سب اگلے روز تیار کرنے کا وعدہ کر کے لے لیتا تھا جب کہ ایک دن میں زیادہ سے زیادہ تین چار ریڈیو ٹھیک کئے جا سکتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ ہر روز درجنوں آدمی دوکان کے اندر اور باہر بیٹھے رہتے تھے اور گھنٹوں اپنا وقت ضائع کر کے گھروں کو خالی ہاتھ چلے جاتے تھے۔ مگر اس کا سب سے بڑا فن یہ تھا کہ میں نے کبھی کسی شخص کو ناراض یا افسردگی کی حالت میں جاتے ہوئے نہیں دیکھا کچھ تو اس وصف نے گاہکوں کو اس کا گرویدہ بنا رکھا تھا کہ جس ریڈیو اور ٹی وی کو ایک دفعہ دُرست کر دیا۔ دوبارہ اس کے خراب ہونے کے امکانات معدوم ہو جاتے تھے دوسرے یہ کہ وہ اس وقت تک بالکل گنگ اور خاموش رہ کر اپنا کام کرتا رہتا تھا جب تک غیض و غضب کا اظہار کرنے والا منتظر ریڈیو اپنے غصّے کا آخری فائر نہ جھونک دیتا۔ اور جب وہ یہ اطمینان کر لیتا کہ اب اس کا جھاگ سُوکھ گیا ہے تو وہ چائے کا آرڈر دیتا۔ مسکرا کر کہتا آپ تو میرے بزرگ ہیں۔ یہ لیجئے جُوتا اور میرے سر پر مار مار کر اسے توڑ دیجئے کہ میں ہوں ہی اس قابل۔ مگر یقین کیجئے مارکیٹ میں اس کا پُرزہ " فلاں تھرو پیک " کہیں دستیاب نہیں ہے آپ نے مجھے پچاس روپے ایڈوانس دیئے تھے۔ یہ پُرزہ پہلے تیس روپے کا آتا تھا مگر اب ساٹھ روپے کا بھی نہیں ملا۔ اتنی دیر میں چائے آجاتی۔ وہ گاہک چائے پینے کے بعد اس کے پیسے

بھی پلے سے دیتا اور "فلاں تھرو پیپ" کے لئے مزید پچاس روپے بھی ادا کر کے ملک رفیق کا شکریہ ادا کر کے اور اس کی منتیں کر کے چلا جاتا۔ اتنے میں ایک آزردہ خاطر اور گاہک آجاتا اسے ملک رفیق بتاتا کہ اس کے ریڈیو کا "تن تورو" مارکیٹ سے غائب ہے۔ وہ حیران ہو کر پوچھتا۔ ملک صاحب وہ کیا ہوتا ہے؟ ملک صاحب عجیب سی نظروں سے اسے گھورتے اور کہتے۔ آپ اس ریڈیو کے مالک ہیں؟ وہ کہتا جی ہاں!۔ چنانچہ ملک صاحب اس کو ریڈیو مرمت اور ریڈیو کی تکنیک پر خوب درس دیتے اور یوں وہ عملاً ان کی شاگردی میں آجاتا۔ ظاہر ہے کہ استاد اور شاگرد کا رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ بالآخر شاگرد اپنے استاد کی تعظیم کر کے رخصت ہو جاتا۔

ملک رفیق میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ سردیوں کے دنوں میں جب کہ میرے پاس سر چھپانے کی کوئی جگہ نہ تھی اور بچے میں نے اپنے گھریلو حالات سے مجبور ہو کر تقسیم کر رکھے تھے۔ ملک رفیق کی دوکان نعمت غیر مترقبہ سے کسی بھی طرح کم نہ تھی جہاں رات کو دیر تک ہم دروازے بند کر کے فلمی گانے نہایت دھیمی آوازیں سنتے، تاش کھیلتے اور مزے کی نیند سوتے تھے۔ ملک رفیق کی جیبوں کی تعداد ان گنت ہوتی تھی۔ شلوار میں، نیفے میں، قمیص میں، شلوکے میں جیبیں ہی جیبیں ہوتی تھیں۔ پیسے وہ ہمیشہ کسی ایسی جیب میں رکھتا تھا جہاں وہم و گمان کی رسائی نہ ہو سکے چنانچہ اپنی خالی جیبیں دکھا کر وہ دوستوں کو خوب اُلّو بنایا کرتا تھا۔ تاہم کبھی کبھی جب موج میں آتا تھا تو انہی دوستوں پر سب کچھ نچھاور کر دیتا تھا۔

ایک بار میرے اپنے نئے ریڈیو میں کچھ نقص واقع ہو گیا۔ میں نے ملک رفیق سے کہا کہ اسے ٹھیک کر دو۔ کہنے لگا لیجئے ابھی کرتا ہوں۔ وہ دن گیا۔ اگلا دن بھی گزر گیا۔ ہفتہ گیا۔ مہینہ گیا۔ ہر روز اور ہر آن وہ یہی کہتا کہ بس اب اپنا (یعنی میرا) ریڈیو ٹھیک کرنا ہے۔ جب چھ ماہ گزر گئے تو ایک روز میں نے وہ ریڈیو اٹھایا اور زور سے فرش پر دے مارا کہ لو بھئی آئندہ اس کو ٹھیک کرنے کا نام نہ لینا

وُہ بڑے اطمینان سے اُٹھا۔ ٹوٹے ہوئے ریڈیو سے تڑا مڑا سپیکر نکال کر اسے دیوار سے لٹکا دیا۔ جہاں ساٹھ ستّر سپیکر پہلے بھی مصلوب تھے اور کہنے لگا" نعیم صاحب دیکھنا ذرا یہ جگہ خالی خالی تھی۔ اب کتنی سج گئی ہے"

اس کی دوکان کا مالک بھی شاید بدو ملہی سے کوئی تعلق رکھتا تھا جب ملک رفیق ایک روز پاکستان سے باہر چلا گیا اور اس کی دوکان کا کرایہ دینے کے لئے میں اس کے پاس گیا تو اس نے کرایہ لینے سے صاف انکار کر دیا۔ بعد ازاں تین چار ماہ کے بعد جب میں وہاں گیا تو نہ وہاں میرا تالا تھا نہ دوکان ویسی تھی۔ پتہ چلا کہ ملک صاحب کے والد کو دوکان کا مالک ہمراہ لایا تھا۔ وہ دوکان خالی کر کے اس کے حوالے کر گئے ہیں۔ چنانچہ اس نے دوکان کے دو حصّے کر کے کئی گُنا کرایہ کے علاوہ پگڑی اور ٹوپی بھی وصُول کی ہے۔ اب بھی کئی ایسے لوگ مجھے ملتے ہیں جن کے ریڈیو دوکان میں موجُود تھے اور باقی سامان کے ہمراہ چلے گئے ہیں۔ وہ مجھ سے ریڈیو کے بارے میں پُوچھتے ہیں تو میں انہیں یہ کہہ کر جان چھُڑا لیتا ہوں کہ ملک صاحب ریڈیو کے "فلان تھرو پیک" اور "تن تورو" لینے کے لئے گئے ہوئے ہیں۔

فیروز سنز لمیٹڈ

لاہور کی حسین وجمیل شاہراہ قائد اعظم" پر طویل و عریض ہال میں چاروں طرف کتابیں رسالے، طغرے، نہایت قرینے سے رکھے ہوتے ہیں جس جگہ نظر آجائیں سمجھ لیجئے کہ وہ مرحوم فیروز الدین کی شب و روز مساعی کا نقد فیروز سنز ہے۔ جہاں علم و ادب کے تمام شعبوں یعنی تاریخ، افسانہ، ناول، نثر، نظم (انگریزی اُردو) پر ہر قسم کی کتابیں دستیاب ہیں۔ کتابوں کا یہ ساکن سمندر اس شاہراہ پر قائم ہے جسے "دی مال" بھی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا یہاں مختلف ہدایات انگریزی زبان میں تحریر کی گئی ہیں۔ ہال میں داخل ہوتے ہی دائیں ہاتھ "کیشئر" کا کیبن ہے جو بزبان حال یہ کہتا ہے کہ "مایا ہے تو اندر آؤ ورنہ واپس لوٹ جاؤ"۔ لیکن کئی منچلے اس کیبن کی موجودگی کو نظر انداز کرکے اندر کا ایک چکر لگا کر علمی پیاس بجھانے کا ٹھرک پورا کر ہی لیتے ہیں۔

فیروز سنز نہ صرف ایک عظیم قابل قدر قدیمی طباعتی ادارہ ہے بلکہ اس نے کئی دیگر کاروباری شعبوں میں بھی نمایاں کارکردگی دکھائی ہے اور یوں مُلکی صنعتی و اقتصادی ترقی میں بھی اہم اور قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ بالخصوص عمدہ قسم کے نہانے کے صابن اور ادویہ سازی میں اس ادارے کا ایک مخصوص مقام ہے لیکن چونکہ یہ ادارہ طباعت و اشاعت کتب کے سلسلے میں معروف ہوا تھا۔ اس لئے آج بھی اس کا اصل کریڈٹ کتابوں ہی کی اشاعت وطباعت اور ان کے وسیع پیمانے پر سیل کا کام ہے یوں تو اس کا صدر دفتر لاہور میں ہے۔ لیکن اس کی شاخیں ملک کے اکثر اہم کاروباری اور صنعتی شہروں میں کھلی ہوئی ہیں۔

لاہور کا صدر دفتر اسی خوب صورت ہال کے عقب میں قائم ہے جہاں میزوں پر، الماریوں میں، ریکوں میں، دائیں بائیں، اوپر نیچے کتابیں ہی کتابیں ہیں جنہیں دیکھ کر یہاں آنے والوں کو یہ احساس ہوتا ہے کہ علم و ادب کے بحرِ ذخّار میں کھڑے ہیں جہاں ہر کتاب خرید لینے کو دل مچل مچل جاتا ہے۔ مجھے جب بھی موقعہ ملتا ہے میں اس سمندر میں "ڈبکی" لگا آتا ہوں۔ اکثر و بیشتر کتابوں کے صرف ٹائیٹل دیکھ کر ہی طبیعت کو قرار آجاتا ہے اور میرے دل کی گہرائیوں سے فیروز سنز کے بانی جناب مولوی فیروز الدین خاں کے لئے ان کی قابل اور علم دوست اولاد کے لئے اور ادارے کے منتظمین کے لئے دعائیں نکلتی ہیں۔

ایک زمانے میں یہاں ثناء اللہ خاں ڈائریکٹر تصنیف و تالیف ہوا کرتے تھے میں نے ان دنوں خلفائے اربعہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کی سیرت و سوانح جمع کئے تھے ان میں سے خلیفہ اوّل حضرت ابوبکر صدیق رضہ کی سیرت و سوانح مہاشہ فضل حسین نے گیلانی الیکٹرک پریس سے طبع کروائے تھے میں نے اس کی ایک کاپی بطور نمونہ ثناء اللہ خاں کو بھجوائی اور تین خلفاء کے سوانح شائع کرنے پر انہیں آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ خاں صاحب نے بواپسی ڈاک میرا شکریہ ادا کیا اور لکھا کہ جب کبھی اس قسم کا پروگرام بنا مجھے زحمت دی جائے گی۔ وقت گزر گیا

ثناء اللہ خاں بھی فیروز سنز سے رخصت ہوئے ایک روز میں نے "فیروز سنز" کے سٹال پر خلفائے راشدین پر ایک خوب صورت کتاب دیکھی۔ بصد احترام اور شوق اسے آنکھوں سے لگایا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ خلیفۂ اول کا باب اکثر و بیشتر مجھ ناچیز کی مطبوعہ سیرت ابوبکر صدیق رضہ سے سو فی صد نہیں تو نوّے فی صد مطابقت رکھتا تھا۔ بے حد مسرت ہوئی۔ فیروز سنز کے حق میں دل

سے مزید دعائیں نکلی۔ کہ میں بے وسیلہ جس کام کو نہ کر سکا وہ اس نے کر دیا۔ میرا مقصد تو یہی تھا کہ لوگ حضرت ابوبکر صدیقؓ کی حیات طیبہ سے درس لیں ان کے عشق رسولؐ کے جذبے کو اختیار کریں اور صدیق بننے کی کوشش کریں۔ یہ تالیف شائع کر کے اس ادارے نے عملاً میری معاونت کی۔ جس کے لیے میں تہہ دل سے اس کا ممنون ہوا۔ رہا نام کا معاملہ تو میں اسے بالکل لایعنی اور مہمل تصور کرتا ہوں۔ دُنیا کی ہر چیز فانی ہے اصل چیز تو کام اور کام ہے۔ میں اس قابل کہاں ہوں کہ کسی عظیم کتاب پر میرا نام آتے۔ ہو سکتا ہے سہو نظر یا سہو کتابت سے یہ نام رہ گیا ہو۔ کیونکہ کتابت کا سہو طباعتی سلسلوں میں عام فہم اور بالکل معمولی سی بات ہے۔ ذکر ہو رہا تھا فیروز سنز کا۔ بلاشبہ اس عظیم ادارے نے علم و ادب کی بے پناہ خدمت کی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی اسے اس دنیا میں ملنے لگا ہے۔

فیض احمد ظفر

کراچی سے دوستی کا آغاز ہوا۔ وہ خود منڈی بہاؤالدین پہنچ گیا مگر اب بھی جب کبھی موقع ملتا ہے ملاقات کر لیتا ہے۔ بہت بڑھیا آدمی ہے۔ ایک روز اپنی گاڑی میں آیا۔ میری اہلیہ نے ضد کی کہ اسے کہو ہمیں سیر کرا لائے اس کی ضد کو ٹالنا کسی بھی ذی ہوش کے بس کی بات نہیں ہے وہ چونکہ اس امر سے آگاہ تھا کہ بھابی اس سلسلے میں معذور ہے۔ اور اسی کی وجہ سے اقتصادی و معاشی طور پر اس حال کو پہنچا ہوں کہ بچوں کی تعلیم کا سلسلہ منقطع کرنا پڑا۔ لہٰذا وہ بے چارہ اپنے ایک ضروری پروگرام کو فراموش کر کے ہمیں سیر کرانے لے گیا۔

دوسری بار آیا تو "اون پیدل" تھا۔ میری بیوی کہنے لگی کہ "اچھا۔ آپ کار کیوں نہیں لائے" اس نے کہا کہ بھابی پٹرول نہیں ملا۔ اس لئے نہیں لا سکا۔ کہنے لگی" سب بہانے ہیں۔ میں جانتی ہوں" اس نے سُنا تو حسب معمول قہقہے میں سب کچھ اچھال دیا۔

کارپوریشن کا ٹرک

میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دو تین بار زلزلے کے شدید جھٹکے بھی دیکھے ہیں۔ بھارت کے فضائی حملوں اور اپنے شاہینوں کو دشمنوں کے جہازوں پر جھپٹتے بھی دیکھا ہے۔ توپ کے گولے اور ان کی ہولناکیاں بھی دیکھی ہیں مگر آج تک ان زمینی و آسمانی آفات میں ہر شخص کو دم دبا کر (جب کہ کسی کی دُم ہوتی ہی نہیں) سراسیمہ، وحشت زدہ اس طرح بھاگتے نہیں دیکھا۔ جیسے کارپوریشن کے ٹرک کو دیکھ کر لوگ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں بازار کھُلا ہے۔ لوگ خرید و فروخت میں مصروف ہیں۔ فٹ پاتھ پر کاریں پارک کر کے خوبرو فیشن زدہ خواتین اصلی سیبوں کا بھاؤ تاؤ کر رہی ہیں۔ ایک کونے میں سڑک سے بہت ہٹ کر ایک حلیم فروش سے غریب اور نادار طبقہ سے تعلق رکھنے والے پیٹ کی آگ کو سرد کرنے میں مصروف ہیں۔ یکبارگی، غل غپاڑہ ہونے لگتا ہے آگیا۔ آگیا۔ بچ جاؤ۔ دیگچے ہاتھوں میں اٹھائے نان زمین پر گرائے چھابڑی فروش، حلیم فروش، چھولے فروش بھاگ کھڑے ہوتے ہیں کارپوریشن کا ٹرک ریفری کے فرائض سرانجام دیتا ہے جو شخص چار سو میٹر کی اس دوڑ میں پیچھے رہ جاتا ہے یا فاؤل کرتا ہے۔ اسے پکڑ لیا جاتا ہے اور کارپوریشن کی حیثیت کے مطابق اسے جرمانہ کر دیا جاتا ہے۔ فٹ پاتھ پر قبضہ کرنے والی کاروں کے خوشحال مصنوعی سرخ چہرے۔ روٹی تو کسی طور کما کھانے والے اِن مچھندروں کی حالتِ زار کا مسکراتے ہوئے مشاہدہ کرتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے ذمہ کم از کم دس پندرہ افراد کا نان و نفقہ لگا ہوا ہے۔ بے روزگاری، مہنگائی اور افراطِ زر کے اس دَور میں یہ غریب چھابڑی فروش اپنی محنت و مشقت کی بناء پر خصوصی ایوارڈ کے مستحق ہیں جو کسی نہ کسی طرح اپنی ذمہ داریاں نبھا رہے ہیں پھر ان کی بدولت بے شمار چہرے

اپنی تنگ دستی اور ناداری کے عیوب ڈھانپنے میں کامیاب ہیں کہ ایک آدھ روپے میں وہ پیٹ کے دوزخ کو مطمئن کر ہی لیتے ہیں۔ مگر کارپوریشن کے ٹرک کو، یہ لوگ ایک آنکھ نہیں بھاتے جو سڑک سے بہت پیچھے ہٹ کر اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لئے اپنی ریڑھیاں اور چھابے لگاتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ اگر ان لوگوں کو سڑک کا فٹ پاتھ استعمال کرنا ہے تو یہ کاریں کیوں نہیں خرید لیتے۔ کاروں پر نان چھولے لگائیں۔ سڑک کو استعمال کریں۔ کوئی ماں کا لال اس پر معترض نہیں ہوگا ؂

کاوش بٹ

کاوش بٹ لالہ موسئے کی صحافت کا بلڈوزر ہے صحافی سے کہیں اچھا شاعر ہے اور بہت خوب صورت غزلیں کہتا ہے۔ عقل مند دشمن اور مخلص دوست ہے۔ کبھی کبھار غلط فہمیوں کا بھی شکار ہو جاتا ہے بہ ایں ہمہ جو کچھ ہے صاف اور کھرا ہے۔ اپنی انفرادیت کو ہر حال میں قائم رکھتا ہے اور اپنا وجود سب سے الگ تھلگ ہو کر منوانے کی کامیاب کوشش کرتا ہے۔ سال میں ایک آدھ مشاعرے کا اہتمام کر کے علم و ادب کی خدمت کرتا ہے اور اس میڑھی کو ہنر مندی سے استعمال کر کے اپنی اور اپنے دوستوں کی مالی مشکلات دور کرتا ہے خود بھی سیر ہو کر کھانے کا عادی ہے اور اپنے رفقائے کار اور ساتھیوں کو بھی پیٹ بھر کر کھانے کا مشورہ دے کر مسرت محسوس کرتا ہے ؂

کباڑیا

ایک روز رات کو گیارہ بارہ بجے ریگل چوک میں مجھے پیچھے سے کسی نے آواز دی کہ ریلوے سٹیشن جانے کے لئے کیا کوئی سواری مل جائے گی" میں نے مڑ کر دیکھا تو وہ دو آدمی تھے۔ دونوں ہی وضع قطع سے سادہ قسم کے دیہاتی نظر آتے تھے۔ اس روز سڑک پر کسی وجہ سے ٹریفک خاصی کم تھی اور یوں بھی آدھی رات کا سماں تھا۔ میں نے ان سے کہا کہ ریلوے سٹیشن جانے کے لئے شاید ہی انہیں کوئی سواری یہاں سے مل سکے۔ البتہ اگر وہ پیدل نہ جانا چاہیں تو میرے ہمراہ لکشمی چوک چلیں وہاں سے کوئی نہ کوئی سواری انہیں یقیناً مل جائے گی۔ چنانچہ وہ میرے ہمراہ بیڈن روڈ پر چل پڑے۔ اثنائے راہ انہوں نے دھیرے دھیرے کچھ باتیں بھی کیں۔ جو ان کے جان بوجھ کر پیچھے رہ جانے کی وجہ سے میں نہ سن سکا اور نہ ہی مجھے کوئی ایسی خواہش یا ضرورت تھی۔ کہ میں ان کی باتیں سنتا۔ میں نے ان سے رسماً پوچھا کہ وہ کہاں سے آئے ہیں اور اس وقت کہاں جانا چاہتے ہیں۔ جس پر انہوں نے بتایا کہ وہ کسی مقدمے کے سلسلے میں ایک وکیل سے ملنے آئے تھے۔ لیکن بسیار کوشش کے باوجود ان کا کام نہ بنا اور وہ واپس ملتان جا رہے ہیں جہاں ان کی رہائش ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہوں نے کھانا وغیرہ بھی کھایا ہے یا نہیں اور یہ کہ لاہور والوں کو ملتان جا کر بدنام کرنے کا ارادہ تو نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے یہ بتا دیا کہ بھاگ دوڑ میں کھانا کھانے کی انہیں فرصت ہی نہیں ملی۔ خیر میں انہیں لکشمی چوک میں واقع چودھری ریسٹورنٹ میں لے گیا اور انہیں خوب کھانا

وغیرہ کھلایا اور بعد ازاں ریلوے سٹیشن جانے والے ایک تانگے پر سوار کرا دیا اور انہیں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر رات کو انہیں گاڑی نہ ملے تو وہ زیادہ رقم گرہ میں ہونے کی صورت میں کسی ہوٹل کا کمرہ کرایہ پر لے لیں "منجی بستر" نہ لیں اور اگر وہ "پلے زر" نہیں تو کہیں بھی رات گزار سکتے ہیں۔ تانگے میں بیٹھنے کے بعد انہوں نے کہا کہ باؤجی اگر کبھی ملتان آنا ہو۔ بلکہ ہماری خواہش ہے کہ آپ ملتان آئیں تو ہمیں ضرور ملیں۔ انہوں نے اپنے نام بھی بتائے جن میں سے ایک کا نام جو نوجوان تھا شیر محمد تھا اور دوسرے کا نام میرے حافظے سے ہمیشہ ہی نکل جاتا رہا ہے۔ حالانکہ دو لفظی نام تھا۔ جیسے بھوندو، عیدو وغیرہ انہوں نے یہ بھی بتایا کہ ان کو تلاش کرنے میں کوئی دقت نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ ملتان میں لاریوں کے اڈے پر ہی وہ کباڑیوں کا کام کرتے ہیں۔ خیر بات آئی گئی ہو گئی۔ میں بھوندو یا عیدو کے ساتھ ساتھ شیر محمد کا نام بھی بھول گیا کہ ایک روز میں اپنے دوست محمد اکرم طاہر کو ملنے کراچی گیا تو اس نے بتایا کہ ملتان کے نواحی ایک چک کا رہنے والا کوئی نوجوان اس کو دھوکے سے کچھ رقم سے محروم کر گیا ہے اگر ملتان میں کوئی واقفیت ہو تو وہاں چلنا چاہیے۔ مجھے فوری طور پر ان کباڑیوں کا خیال آیا مگر دونوں کے نام حافظے میں نہ آئے۔ میں نے اس سے کہا کہ ملتان چلنے کی تیاری کرے۔ چنانچہ ہم ملتان پہنچ گئے۔ وہ باربار مجھ سے پوچھتا رہا کہ ہمیں کس سے ملنا ہے مگر مجھے نام یاد نہیں آرہے تھے۔ اسے کیا بتاتا۔ ملتان سٹیشن پر پہنچ کر جب میں نے اسے بتایا کہ جن سے ملنا ہے ان کے نام یاد نہیں آئے تو وہ سر کو پکڑ کر رہ گیا اور متوحش ہو کر کہنے لگا کہ پھر کراچی سے آنے کی کب ضرورت تھی۔ خواہ مخواہ مزید خرچہ کیا۔ میں نے کہا "برخوردار مجھے تو واپس لاہور آنا ہی تھا۔ لہٰذا ایک آدمی کا خرچہ تو اس میں سے نکال دو۔ باقی رہ گیا دوسرے کا صرفہ تو وہ بھی واپس کراچی نہ جاتے۔ یہیں رہ جاتے۔ اس سے یہ مذاق ہوتا رہا۔ ادھر ہم لاریوں کے اڈے پر پہنچ گئے۔ مجھے اتنا یاد تھا کہ وہ کباڑیے

ہیں اور میو ہیں۔ اس لئے میں۔ نے سوچا کر کباڑیوں کی مارکیٹ سے شاید کوئی سراغ مل جائے۔ وہاں گئے تو جمعہ کی وجہ سے تمام مارکیٹ بند تھی۔ اکرم یہ دیکھ کر مزید پریشان ہوگیا اور میں اس کی حالت دیکھ کر مزید لطف اندوز ہونے لگا۔ مارکیٹ کے ایک سرے پر ایک نو عمر لڑکا بیٹھا تھا۔ میں نے کہا کہ تم یہاں کیا کرتے ہو۔ کہنے لگا۔ جی ہم کباڑیے ہیں۔ میں نے کہا کہ اس مارکیٹ میں جس قدر کباڑیے ہیں ان کو جانتے ہو۔ کہنے لگا جی ہاں۔ میں نے کہا سب کے نام لو اس نے کسی طوطے کی طرح نام پکارنے شروع کر دیئے مگر میرا مطلوبہ نام مجھے سنائی نہ دیا۔ ہم وہاں سے آگے چلے تو ایک شخص اپنا کھوکھا صاف کر رہا تھا اور ایک دوسرا آدمی اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ یار بھوندو یا عیدو کے نام سے ملتے جلتے نام کا کوئی عمر رسیدہ کباڑیا اس مارکیٹ میں ہے؟ ابھی وہ کچھ سوچ ہی رہا تھا کہ کھوکھے والے نے مجھے بازو سے آپکڑا کہ جناب اِدھر آجایئے۔ اس نے ساتھ والے کمرے سے لوہے کی دو کرسیاں نکالیں اور خود غائب ہوگیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پورا کریٹ بوتلوں کا لئے ہوئے آگیا۔ میں نے کہا بھئی یہ کیا۔ ہم اتنی بوتلوں کا کیا کریں گے؟ کہنے لگا۔ بابوجی لاہور میں تو آپ نے ہمیں یہ کہہ کر زبردستی زیادہ کھانا کھلایا تھا کہ سفر میں جب اور جتنا ملے۔ خوب کھا پی لینا چاہیئے۔ میں نے غور سے اسے دیکھا تو اس نے بتایا کہ وہ شبیر محمد ہے اور یکے از دو مسافران ہے جنہیں لاہور میں میں نے زبردستی مہمان بنایا تھا۔ اس نے بتایا کہ بوڑھے میاں کا نام بھوندو یا عیدو نہیں بلکہ ..... ہے وہ آج ہی صبح کراچی گیا ہے اس نے یہ بھی کہا کہ ہم آپ کو اکثر یاد کرتے رہتے ہیں۔ کیونکہ لاہور میں جب آپ ہمیں ملے تھے ہمارے پاس دس بارہ ہزار روپے کی رقم تھی۔ بیڈن روڈ پر ہم نے آپس میں یہی بات کی تھی۔ کہ اگر ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ اس نے کی تو ہمیں تیار رہنا چاہیئے مگر بابوجی جب آپ نے ہوٹل سے ہمیں کھانا کھلایا

اور ہمیں پیسے بھی نہ دینے دیئے اور تانگے میں سوار کرایا۔ نیز کمرہ لینے کے بارے میں قیمتی نصیحتیں بھی کیں تو ہم بہت شرمندہ ہوئے اور ہر روز دعائیں مانگتے تھے کہ آپ کہیں مل جائیں۔

آج جمعے کی چھٹی تھی۔ میں کبھی جمعے کو یہاں نہیں آیا۔ مگر آج مقدر مجھے یہاں کھینچ کر لے آیا کہ آپ سے ملاقات ہو جاتی" بعد ازاں وہ ہمیں اپنے گھر لے گیا اور ہماری خوب خدمت تواضع کی۔ اس کباڑیے سے پتہ چلا کہ اس نے چار پانچ لاکھ کی زمینیں خریدی ہیں اور مکان وغیرہ بھی بنائے ہیں۔ اکرم کہنے لگا۔ "تمہاری دوکان کہاں ہے؟" وہ ہنس کر بولا جناب وہ کھوکھا ہی تو ہماری دوکان ہے۔ جہاں آپ ہمیں ملے ہیں ؎

کلاسیک

آغا امیر حسین نے کتابیں چھاپنے اور انہیں علم و ادب کے شائقین تک پہنچانے کے لئے "کلاسیک" کا آغاز بیرون لوہاری دروازہ میں کیا تھا بعد ازاں فطری تبدیلی اور انقلاب زمانہ انہیں کشاں کشاں دی مال پر لے آیا۔ جہاں مال ہی مال ہے یہ ملک کا اغلباً واحد کتاب گھر ہے۔ جس کی دیواروں پر ارشادِ خداوندی اور احادیث نبوی جلی الفاظ میں کندہ ہیں جن کا تعلق فتنہ و فساد کے روکنے اور تحصیل علم سے ہے۔ آغا صاحب علمی دنیا سے تعلق رکھنے والے بیشتر احباب کو ذاتی طور پر جانتے ہیں یہی وجہ ہے کہ "کلاسیک" میں لکھنے لکھانے والے حضرات کی آمد و رفت جاری رہتی ہے۔ جن میں سے ہر ایک کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ آغا صاحب اُن سے مُسکرا کر ملیں۔ چنانچہ ملتے تو وہ مسکرا کر ہی ہیں مگر ان کے ہاتھ میں قلم اور "بِل بُک" دیکھ کر بے چارے ادیبوں کی سِٹّی خواہ مخواہ گُم ہو جاتی ہے ⁘

کم سِن ہمسفر

لاہور سے لالہ موسیٰ پسنجر کی پہچان یہ ہے کہ اس کا کوئی ٹھکانہ اور پلیٹ فارم نہیں ہے۔ اپنی بہنوں کی طرح یہ "مِس پسنجر" بھی ٹائم ٹیبل سے قطعاً بے نیاز ہے۔ خدانخواستہ کسی پلیٹ فارم پر وہ آپ کو مِل جائے اور لاہور سے چھک چھک چھوں چھاں کرکے روانہ بھی ہوجائے تو بادامی باغ یا شاہدرہ سے آگے جانا کسی معجزے سے کم نہیں ہوگا۔ میں بالعموم اس گاڑی سے سفر کرتا ہوں تاکہ اگلے روز بروقت اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ جاؤں۔

گزشتہ دنوں میرا سیٹ فیلو ایک ایسا نوجوان تھا۔ جس کی کم سِنی ابھی تک چہرے سے رُخصت نہیں ہوئی تھی۔ اس کے سادہ سے کپڑوں اور محتاط سی گفتگو نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کردیا کہ وہ بظاہر وُہ نہیں جو بباطن ہے چنانچہ میں نے اُسے کریدا تو مٹی کے ڈھیر میں لعلِ یمن پایا۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں مجھے دو کہانیاں سنائیں جو ذیل میں محض اس لئے درج کرتا ہوں کہ بہت سبق آموز اور پُر از حقائق ہیں۔ محمد رؤف کہ اس نوجوان کا نام تھا کہنے لگا کہ:۔

"ایک شکاری نے ایک مرتبہ چڑیا پکڑلی۔ جب وُہ اسے ذبح کرنے لگا تو وہ کہنے لگی کہ اگر تم میری جاں بخشی کردو تو تمہارے لئے بہت سُودمند ہوگا کیں تمہیں ایک چھٹانک گوشت کے بدلے تین ایسی باتیں بتاؤں گی جس سے تمہاری تمہاری عمر ہنسی خوشی بسر ہوگی۔ شرط صرف یہ ہے کہ پہلی بات تمہاری ہتھیلی پر، دوسری سر پر اور تیسری اپنی مرضی کی جگہ پر بیٹھ کر سناؤں گی۔ شکاری نے اس کی شرطیں مان لیں۔ چنانچہ اس نے ہتھیلی پر بیٹھ کر کہا کہ (۱) جب کبھی کوئی کام کرو سوچ سمجھ کر کرو۔ یہ کہہ کر وُہ سر پہ جا بیٹھی اور کہنے لگی (۲) جو کچھ ہو جائے اس پر

پچھتایا نہ کرو۔ یہ کہا اور پھر سے اُڑ کر درخت پر بیٹھ گئی اور کہنے لگی (۳) اگر تم مجھے رہا نہ کرتے تو میرے پیٹ سے پاؤ بھر کا لعل برآمد کرتے۔ یہ سُننا تھا کہ شکاری بہت پشیمان ہوا اور سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ چڑیا کہنے لگی۔ بھولے بادشاہ میری دونوں نصائح تم ابھی سے فراموش کر رہے ہو۔ یہ تو سوچا ہوتا کہ اتنا بڑا لعل اس کے پیٹ میں آ بھی سکتا ہے ؟

دوسری کہانی اس نے یوں بیان کی کہ :۔

" ایک دفعہ عقل اور تقدیر میں جھگڑا ہو گیا۔ دونوں میں سے ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ وہ اپنے مدِمقابل سے زیادہ طاقتور ہے۔ فیصلے کے لئے ایک کسان کو ہدف مقرر کیا گیا۔ چنانچہ کسان اپنے کھیت میں ہل جوتنے کے لئے گیا تو مقدّر نے ہل کے سامنے سونے کی اینٹ رکھ دی۔ یہ دیکھ کر عقل کسان سے دُور ہٹ گئی۔ کسان نے اینٹ کو دیکھا تو لگا مقدّر کو کوسنے دینے کہ میرے ہل کا پھالا اس نے توڑ دیا۔ ایک دانا آدمی وہاں سے گزر رہا تھا اس نے کسان کے بین سُنے تو حقیقت کو تاڑ لیا۔ اور سونے کی اینٹ ہتھیا کر چلتا بنا۔ مقدر کو بہت طیش آیا کہ سونے کی اینٹ بھی دی اور اُلٹا کسان سے گالیاں بھی کھائیں خیر اس نے فصل اُگی تو مکئی کے بھٹوں میں یاقوت اور جواہر لگا دیئے۔ کسان نے اِن کو دیکھا تو لگا تقدیر کا رونا رونے۔ اس بار بھی اس نے اپنی ساری فصل یعنی یاقوت و جواہر اسی عقلمند کی جھولی میں ڈال دیئے۔ دریں اثنا بادشاہ کو خبر ملی کہ فلاں شخص کے پاس بے شمار یاقوت و جواہر ہیں۔ اس نے اس کی گوشمالی کی تو اس نے بتایا کہ یہ فلاں کسان کی ملکیت ہیں تقدیر نے بادشاہ کے دل میں ڈالا کہ وہ کسان سے اپنی بیٹی کی شادی کر دے چنانچہ شہزادی کی شادی بڑی دھوم دھام سے اس کسان سے ہو گئی۔ آخری مرحلہ پر عقل پھر کسان کو چھوڑ کر الگ ہو گئی۔ چنانچہ اس نے شہزادی کو دیکھا تو ڈر کے مارے چارپائی کے نیچے گھس گیا۔ شہزادی کو بڑا تاؤ آیا کہ یہ کس جانور سے میری شادی کر دی گئی ہے۔ چنانچہ وہ غم و غصے کے عالم میں بادشاہ

کے سامنے گئی اور ماجرائے غم بیان کیا۔ بادشاہ غصے سے لال پیلا ہو کر تلوار سونت کر باہر نکلا۔ دریں اثنا تقدیر نے عقل کو زیادہ طاقتور تسلیم کر لیا اور اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کہا کہ ہماری لڑائی میں غریب کسان مارا گیا تو لوگ دوش تمہیں ہی دیں گے۔ خدا کے لئے کچھ کرو۔ چنانچہ عقل فوراً کسان کے دماغ میں جا گھسی۔ وہ تلوار سونت کر دروازے میں کھڑا ہو گیا۔ اِدھر بادشاہ وہاں آ پہنچا۔ بادشاہ نے کہا کہ تم نے شہزادی کی قدر نہیں کی۔ وہ کہنے لگا میں تو صبح سے منتظر ہوں کہ آج شہزادی سے میری شادی ہوگی۔ مگر نہ جانے درباری اور بادشاہ کہاں ہیں۔ ابھی ان کی خبر لیتا ہوں۔ بادشاہ کہنے لگا کہ وہاں لاتعداد سپاہی اور بادشاہ کے جاں نثار ہیں۔ تم اکیلے وہاں کیا کرو گے۔ کہنے لگا شہزادی میری عزت ہے اور اپنی عزت کی حفاظت کرنا میرا فرض ہے۔ اس راہ میں اگر جان جاتی ہے تو جائے کیا پروا ہے۔ بادشاہ اس کی بہادری پر بہت خوش ہوا اور اسے اعزازات سے نوازا ٭

کنڑی سندھ

میرے ایک واقفِ حال دوست نے بیس بائیس برس بیشتر کنڑی کاٹن جننگ فیکٹری ٹھیکے پر لے لی۔ اور مجھے بصد اصرار وہاں جانے کے لئے کہا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں۔ مہم جوئی اور نت نئے تجربے کرنا میری فطرت کا خاصہ ہیں میں نے بخوشی حامی بھر لی۔ کنڑی، حیدرآباد سندھ سے بذریعہ ریل کافی مسافت پر واقع ہے۔ ان دنوں اس رُوٹ پر بسیں چلنا شروع نہیں ہوئی تھیں اور ریل ہی واحد ذریعۂ سفر تھا۔ حیدرآباد سے میرپُور خاص تک چھوٹی لائن ہے میرپُور سے آگے یا پیچھے جو چاہے کہہ لیجیے۔ دُنیا کی طرح ایک گول لائن ہے۔ گاڑی میرپُور سے چلتی ہے اور واپس میرپُور پہنچ جاتی ہے اس گول لائن پر فضل بھمبرو، نبی سر روڈ اور کنڑی کے سٹیشن واقع ہیں۔ باقی سٹیشنوں کے نام اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔ گاڑی چلتی کم تھی۔ رُکتی اور رینگتی زیادہ تھی۔ لاہور سے جتنی دیر میں حیدرآباد آیا اس سے کہیں زیادہ وقت حیدرآباد سے کنڑی جانے میں صرف ہوا۔ خیر فیکٹری میں اس حال میں وارد ہوا کہ آئینے میں اپنے آپ کو دیکھا تو کسی آسیب یا بھُوت کا گمان ہونے لگا۔ نہا دھو کر پُورے چوبیس گھنٹے بغیر کچھ کھائے پیئے بے سدھ پڑا رہا۔ اس سے اگلے روز فیکٹری کا چکر لگایا تو خاصی رونق نظر آئی۔

"پھُٹی" یعنی کپاس اس علاقے کی اہم پیداوار ہے۔ غریب اور متوسط طبقہ کے کسان آڑھتیوں سے سارا سال قرض لیتے رہتے ہیں اور سال بھر کی کمائی اس کے سپُرد کر کے پھر قرض کے چنگل میں پھنس جاتے ہیں۔ یوں وہ خوش حالی کا منہ نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ ان کی محنت و کاوش کے طفیل یہ آڑھتی لاکھوں کروڑوں میں کھیلتے ہیں ان دنوں "پھٹی" کا تمام کاروبار ایک مشہور ہندو آڑھتی لوکومل ٹہل رام کے ہاتھوں میں تھا۔ لوکومل ٹہل رام میں سے ایک باپ تھا۔ دوسرا بیٹا۔ اب یہ یاد نہیں رہا کہ لوکومل باپ کا نام تھا یا بیٹے کا۔ البتہ یہ ضرور یاد ہے اور عمر بھر یاد رہے گا

کہ بیٹے کی شکل و صورت کوہ قاف کی روایتی پریوں سے بھی کہیں زیادہ جاذب نگاہ تھی موٹی موٹی سرمئی آنکھیں جن میں بلا کی مستی، قندھاری انار جیسا سرخ رنگ پھٹی کے ڈھیر میں کھڑا یوں محسوس ہوتا تھا گویا ہتھیلی پر سرسوں جما رہا ہے۔ جواں دلوں کی آرزوؤں اور غریب کسانوں کا ایک مدت تک بیڑا غرق کرنے کے بعد یہ ہندو فیملی کسی چور دروازے سے ہمارے وہاں سے چلے آنے کے کئی برس بعد کروڑوں روپے سمیت بھارت جانے میں کامیاب ہو گئی اور یوں اس کی چیرہ دستیوں سے علاقے کے مسلمان کسانوں کو نجات ملی۔

میرے فیکٹری میں جانے کے چند روز بعد کراچی سے ایک مارواڑی رحیم بھائی ایک بنک کے گودام کیپر کی شکل میں نمودار ہوا۔ رحیم بھائی یا تو بہت بڑھیا قسم کا سگریٹ پیتا تھا یا بیڑیوں پر گزارہ کرتا تھا ایک پوکر لڑکی جس کا خاندان "پھٹی" کے بورے تیار کرنے کا کام کرتا تھا۔ جب کسی کام سے اِدھر اُدھر جاتی تو یوں محسوس ہوتا گویا بجلی کوند گئی۔ کم بخت کا بھرا بھرا نمکین جسم، غلافی آنکھیں اور سترہ، اٹھارہ برس کا سن قیامتِ صغریٰ سے کم نہ تھا۔

فیکٹری کے نوجوان کارکن اور مزدور اس سے آنکھیں سینکنے لگے۔ رحیم بھائی ان کی اخلاق سے گری ہوئی اِن حرکات کا بڑی سختی سے نوٹس لیتا اور "ورجوانی توبہ کردن" پر روزانہ بلکہ ہر گھڑی نہایت فصیح و بلیغ لیکچر پلاتا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم سب رحیم بھائی کا بے حد احترام کرنے لگے اور اس کی موجودگی میں غضِ بصر اور ایوبی صبر سے کام لینے لگے۔ ایک روز جب بنولے کے ڈھیر آسمان سے جا لگے اور اس کی فروخت ضروری قرار پائی تو میں محمود ظفر جو ایک انتہائی زندہ دل نوجوان تھا اور چند مزدوروں کے ہمراہ بنولہ اٹھوانے کے انتظامات کروانے کے لئے اِدھر گیا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ رحیم بھائی اور وہ پوکر لڑکی انتہائی ناگفتنی حالت میں بنولے پر گڈمڈ پڑے یک جان یک قالب نظر آ رہے تھے۔ میرے ہمراہی کچھ تو پوکری کے حسن و شباب کے سوختہ تھے اور کچھ رحیم بھائی کے لیکچروں سے عاجز آئے ہوئے تھے انہوں نے آؤ

دیکھا نہ تاؤ، رحیم بھائی کی خوب مرمت کردی۔ رحیم بھائی بے چارہ خاموشی سے اٹھا اور اپنا بریف کیس لے کر کُنری سے ہمیشہ کے لئے چلا گیا۔

رات گئے جب ہم فیکٹری سے فارغ ہوتے تو کُنری کے واحد بازار میں واقع ایک ٹی سٹال کا رُخ کرتے۔ ڈاکٹر رشید انور احمد میرا بہترین دوست میرے ساتھ ہوتا۔ یہاں کا خاص آئیٹم ایک مکرانی چھوکرا تھا جو فلمی گانوں کی دُھن پر رقص کیا کرتا تھا۔ غلام حسین ساگا اور آرٹ کونسل میں مشاق رقاصوں اور رقاصاؤں کے رقص بھی میں نے دیکھے ہیں۔ لیکن جو لُطف اس مکرانی کے رقص میں پایا اس کی نظیر کہیں نہ پائی اس کے جسم میں اتنا لوچ تھا کہ سر اور پاؤں دونوں ملانے پر قادر تھا۔ میں ٹی سٹال سے فرمائش کرکے بارہ بجے رات تک انمول گھڑی، جگنو، برسات اور دیگر اہم فلموں کے گانے اور غزلوں کے ریکارڈ بجوا کر مکرانی لڑکے کا رقص دیکھا کرتا اور جب چائے والا کہتا کہ "اب ہم بند کرے گا" تو بادل نخواستہ اُٹھ کر اپنے کمرے کا رُخ کرتا۔

کُنری میں جہاں ہمیں آم اور پپیتا خُوب کھانے کو ملا۔ وہاں ہم نے اُونٹ کی بھی جی بھر کر سواری کی، تھرپارکر، امرکوٹ اور خدا جانے کہاں کہاں تک صحرانوردی کی اسی قسم کے ایک سفر میں جب بھُوک، تکان اور پیاس کے مارے ہمارا بُرا حال تھا۔ ناگاہ ایک چھوٹا سا گاؤں نظر پڑا جہاں مکئی کے بُھٹوں سے ہماری تواضع کی گئی ان بھٹوں کی یاد آج بھی کام و دہن کو نشاط دے جاتی ہے۔

قائداعظمؒ

جسم بے حد دُبلا جیسے پنجاب میں کبھی کاٹھا گنا ہوتا تھا اور بہت سی بیماریوں کا علاج سمجھا جاتا تھا۔ قوم کو کئی بیماریوں سے نجات دلانے والا قائداعظمؒ حوصلہ و ہمت میں بے مثل، فراست میں بے نظیر اور دُوربین نگاہی میں لاجواب تھا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۸ء تک برصغیر پر جھکنے والے آسمان نے "قائداعظمؒ زندہ باد" کے نعروں سے زیادہ واشگاف نعرے نہیں سُنے ہوں گے۔ قائداعظمؒ کو اگر موجودہ دور میں دنیا بھر کے مسلمانوں کا "محسن اعظم" کہا جائے تو اس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ انہوں نے اپنی خداداد فراست، قابلیت، محنت اور دیانت سے ہندو انگریز اور کانگرسی مسلمانوں سے سہ طرفہ لڑائی لڑی، قابلیت میں، سیاست میں، وکالت میں، علم میں، سازش میں، غرضِ کہ ہر میدان میں اپنے حریفوں کو چت لٹایا، دُنیا حیران تھی کہ نحیف و نزار جُثّے پر مشتمل محمد علی جناح کے کل پُرزے کس فولاد یا چٹان سے بنے ہوتے ہیں۔ برصغیر کے مسلمانوں کے کان اس کی آواز پر لگے رہتے تھے اور اس کی نبضیں اس کے دل سے پیوستہ و مربُوط تھیں

قائداعظم بے حد نفاست پسند اور معمور الاوقات انسان تھے مذہبی رواداری ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ذہین و فطین لوگوں کی بے حد قدر کرتے تھے۔ اصولوں کے معاملے میں شدت کی انتہا تک پہنچ جاتے تھے۔ ان کی ان سب خُوبیوں سے ان کے جاننے اور دیکھنے والے بخوبی آگاہ ہیں۔ مگر جو چیز میرے مشاہدے میں آئی اور جس سے میرا ننھا سا دل انتہائی حیران اور بے حد ممنون ہوا وہ یہ ہے کہ پاکستان بننے سے کچھ عرصہ قبل جب مسلمانانِ برصغیر کے

سامنے صرف ایک ہی مقصد تھا یعنی پاکستان کا حصول، میں نے قائد اعظم کے نام دو منی آرڈر مسلم لیگ کے چندے کے طور پر بھجوائے ان میں سے ایک آٹھ آنے کا اور دوسرا صرف دو آنے کا تھا۔ ان منی آرڈروں کا ایڈریس بھی میں نے عجیب وغریب تحریر کیا تھا۔ یعنی ہمارا لیڈر۔ قائد اعظم" اورنگ زیب روڈ۔ نئی دہلی" میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب چند روز بعد مجھے اپنے منی آرڈروں کی رسیدیں موصول ہوئیں جن پر قائد اعظم کے کسی سیکرٹری یا کسی اور صاحب کے دستخطوں کے بجائے خود قائد اعظم کے اپنے دستخط یعنی "ایم اے جناح (بزبان انگریزی) ثبت تھے۔ قائد اعظم کے بارے میں ہر صاحب ذی شعور بخوبی جانتا ہے کہ ان کا ایک ایک لمحہ بے حد قیمتی اور قوم کے لئے وقف تھا۔ ایسے ذی وقار رہنما کا اظہار ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر ذاتی توجہ دینا یہ ثابت کرتا تھا کہ ان کے دل میں قوم کے لئے محض دردہی نہیں انہیں ہر شخص سے بے پناہ محبت ہے جب کہ قائد اعظم کے بعد ہم نے ملک کے دیگر حکمرانوں کی روایت یہ دیکھی کہ ان کو جو خطوط جاتے ہیں ان میں سے اکثر کا جواب ہی موصول نہیں ہوتا اور اگر خدانخواستہ بھولے بھٹکے سے کبھی کوئی جواب آبھی جاتا ہے تو وہ کسی نامعلوم انڈر سیکرٹری یا سیکشن آفیسر کی جانب سے ہوتا ہے بالعموم طبع شدہ یا سائیکلو سٹائل ہوتا ہے۔ اب بتائیے ایسی ریڈ میڈ چٹھیوں سے کسی کے دل میں کیوں کر گھر کیا جاسکتا ہے؟

قائد اعظم کی انہی صفات کی بنا۔ پر وہ قوم کی آنکھ کا تارا اور دل کا سہارا تھے۔

قُربان طاہر

گجراُت کا پُرانا مڈھ ہے۔ ایک ایک وقت میں کئی کئی اخباروں کی نمائندگی کرتا رہا ہے۔ اپنا بھی ایک پرچہ نکالتا ہے۔ قُربان طاہر میں ۹۸ ایسے "اوصاف" ہیں۔ جن کی بنا پر اکثر لوگ اس کے بارے میں مشکوک رہتے ہیں مگر دو خوبیاں ایسی ہیں کہ اسے ان کا کریڈٹ نہ دینا زیادتی ہے۔

اوّل یہ کہ وہ ہماری بھابی "فرخندہ" کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آسمان پر بادل چھا جائیں تو کہے گا کہ صبح فرخندہ نے مجھے زبردستی سردس کے جوتے پہنا دیئے تھے کہ آج شاید بارش ہو جائے۔ ہوٹل میں چائے پینے کی کوئی دعوت دے گا تو کہے گا فرخندہ نے آج جو چائے پلائی ہے اس کے بعد کسی چیز کی گنجائش نہیں رہی اگر کوئی بتائے گا کہ آج پٹرول نہیں مل رہا تو فوراً فرخندہ کے حوالے سے بتائے گا کہ اس نے کل ہی مجھ سے دو گیلن پٹرول زیادہ منگوا لیا تھا۔ کسی روز وہ بچوں سمیت کہیں گئی ہو گی تو خلافِ معمول صبح آٹھ بجے ہی گھر سے باہر نکل آئے گا اور دوستوں کو ڈھونڈ ڈھانڈ کر بتائے گا کہ ساری رات اُسے سردی نے سونے نہیں دیا۔

دوسری خوبی اس کی یہ ہے کہ اسے آپ جو مرضی کہتے رہیں۔ یہاں تک کہ ایسی باتیں بھی کہہ دیں جن سے ایک آدمی کا خون کھولنے لگتا ہے مگر کیا مجال جو وہ آپ کو تند و تلخ لہجے میں کچھ کہے یا اپنے رویے میں اصلاح کرے یا آپ کی باتوں پر ناک بھوں چڑھائے اتنی قوّت برداشت میں نے کسی شخص میں نہیں دیکھی۔

میں نے ایک طویل عرصہ گجراُت میں قیام کیا ہے۔ قربان طاہر واحد دوست ہے جس نے وحدانیت پر قائل ہونے کا ثبوت یوں فراہم کیا کہ اس نے اپنی خوب صورت

کوٹھی میں صرف ایک بار اور وہ بھی تاش پارٹی میں ہمیں دعوت دی۔ بھابی فرخندہ اس روز گھر پر نہیں تھی۔ قربان طاہر نے تنور سے گرم گرم روٹیاں اور چنے کی دال ہمیں کھلائی۔ گو اِن کابل نیازی صاحب نے دیا میں چپکے سے اُٹھا اور فریج کی تلاشی لینے لگا۔ ایک ننھے سے برتن میں کوئی چھٹانک بھر دیسی گھی پڑا تھا۔ وہ میں اٹھا لایا، چنے کی دال میں اس گھی نے وہ لُطف دیا کہ بھابی فرخندہ کے لئے دِل سے دعائیں نکلیں۔

قمر اجنالوی

بے شمار تاریخی ناولوں کے مصنف قمر اجنالوی اس اخبارِ "ملّت" کے اداراتی عملہ میں شامل تھے۔ جس کے ایڈیٹر مشہور صحافی شبلی بی کام (ایم کام) تھے اس اخبار کو اگر اردو صحافت کا سنگِ میل کہا جائے تو کوئی مضائقہ نہ ہوگا۔ جہازی سائز کے اس روزنامہ میں اَدبی صفحات نہایت جاندار قسم کے شائع ہوتے تھے۔ میں بھی اس کے لکھاریوں میں شامل ہوگیا۔ ایک روز ایک دوست نے میری ایک کہانی کی تعریف کرتے ہوئے بتایا کہ اس نے وہ کہانی اس زمانے کے معروف فلمی ماہنامے "فلم لائٹ" میں پڑھی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ اس ماہنامے کو میں نے یہ کہانی نہیں بھجوائی۔ یہ تو میں نے ملّت کو بھجوائی تھی۔ بعدازاں مجھے پتہ چلا کہ قمر اجنالوی کا تعلق دونوں طرف برابر برابر ہے۔ انہوں نے میری کہانی کو اس ماہنامے کے مزاج کے مطابق پایا تو اس میں شائع کر دیا۔ یوں میرا تعارف قمر اجنالوی سے ہوا جس کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نوجوان دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ کسی بات پر کُڑھنا اس کے مسلک کے خلاف ہے۔ بے حد وحساب لکھتا ہے اور لکھتا چلا جاتا ہے۔ اس کی ناولوں پر فلمیں بھی بنتی رہی ہیں اور آئندہ بھی شاید بنتی رہیں گی۔ آج کل "مغربی پاکستان" میں ہے اور ٹھیک ٹھاک ہے۔

لاؤڈ سپیکر

میں دن بھر لکشمی مینشن میں رائٹرز ایسوسی ایشن آف پاکستان کے مرکزی دفتر میں کام کرتا ہوں۔ جہاں ہال روڈ کی درجنوں دوکانوں سے بیک وقت "ہیلو ہیلو" ٹیسٹنگ ٹیسٹنگ کی بے ہنگم آوازیں اور فلمی گانوں کے ریکارڈ کان کھاتے ہیں۔ اس شور و غل سے جب سر میں درد ہونے لگتا ہے تو میں کچھ کام گھر پر کرنے کے لئے اپنے ہمراہ لے جاتا ہوں میرا گھر ایل ڈی اے کے ان کوارٹروں میں ہے جو گزشتہ دنوں گورنر پنجاب اور ایل ڈی اے کے چیئرمین نے بکمال نوازش قیمتاً مجھے الاٹ کیا ہے اور جہاں رہائشی جگہ ناکافی ہونے کی بنا پر اب میں نے ایک بڑا کمرہ اور چار دیواری وغیرہ بھی بنوالی ہے۔ البتہ گھر تک جانے آنے کے لئے بسوں میں غیر معمولی رش کی وجہ سے کئی قیامتوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ شہر سے پندرہ میل دُور ان کوارٹروں میں وہ خاموشی اور فطری سکون ہونا چاہیئے تھا جس کے لکھنے پڑھنے والے بالخصوص شاعر اور ادیب متلاشی ہوتے ہیں۔ مگر یہاں چند گز کے فاصلے پر واقع گاؤں کیر کلاں ہے صبح اذان سے قبل مؤذن صاحب سوئے ہوئے لوگوں کو بیدار کرنے کے لئے پنجابی میں مختصر سی تقریر فرماتے ہیں اور درود و صلوٰۃ کے بعد اذان کہتے ہیں۔ بعد ازاں لوگوں کو نماز میں شمولیت اختیار کرنے کی پر زور تلقین کی جاتی ہے۔ جب کہ قبل ازیں اذان میں وہ حیَّ علی الصلوٰۃ اور حیَّ علی الفلاح بآواز بلند پکار چکے ہوتے ہیں۔ نماز باجماعت بھی اکثر و بیشتر لاؤڈ سپیکر پر ہی پڑھائی جاتی ہے۔ اس کے بعد تقریباً آٹھ بجے صبح تک درس دیا جاتا ہے۔ درس کے

اختتام پر نماز اور درس میں شمولیت اختیار کرنے والوں کو جنت کی بشارتیں لاؤڈ سپیکر پر دی جاتی ہیں اور گھروں میں بیٹھ رہنے والوں کو شدید ترین عذاب اور عقوبت کا سزاوار ٹھہرایا جاتا ہے۔ دریں اثنا پڑھنے والے بچے آنا شروع ہو جاتے ہیں۔ قاری صاحب بچوں کی بہت تھوڑی تعداد کو دیکھ کر لاؤڈ سپیکر پر اپنی ناراضی کا اظہار فرماتے ہیں اور گاؤں کے سب بچوں کو جلد از جلد پہنچ جانے کی نصیحت کرتے ہیں۔ اتنے میں لاؤڈ سپیکر پر بچوں کی پڑھائی شروع ہو جاتی ہے وہ گلا پھاڑ پھاڑ کر وہ دعائیں پڑھنے لگتے ہیں جو قاری صاحب نے انہیں سکھائی ہوتی ہیں اور ساتھ ہی بچوں کی کئی عجیب و غریب آوازیں بھی نشر ہوتی ہیں۔ مثلاً "جی میں پیشاب کر آواں" دوسری آواز آتی ہے "او جا مروئی" اور یوں ۹ بجے تک کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ ابھی لاؤڈ سپیکر پر اللھم نقّنی عن خطایای کما ینقّی الثوبُ الابیضُ من الدّنس... کی آوازیں بلند ہو رہی ہوتی ہیں۔ کہ میں بے بسی کے عالم میں بس کی تلاش میں گھر سے نکل آتا ہوں۔ رات کو سات بجے جب بس سٹاپ پر واپس آتا ہوں تو لاؤڈ سپیکر پر اعلان ہو رہا ہوتا ہے کہ:۔

"عشاء کے بعد ایک متبحر عالم جن کو اللہ تعالےٰ نے علم و حکمت سے سرفراز کیا ہے اور گو ابھی ان کی ڈاڑھی مونچھ نہیں آئی مگر وہ بحر حکمت کے موتی نچھاور کرتے ہیں۔ درس دیں گے ۔، احباب اس درس میں شامل ہو کر ثواب دارین حاصل کریں۔

چنانچہ ٹھیک آٹھ بجے شب یہ متبحر عالم سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد آیات قرآنی ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ غنیٌ حمید ہ سے اپنا پُر معارف درس شروع کرتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ میں محض قرآنی معارف بیان کروں گا کسی فرقے یا مسلک کی دلآزاری کرنا میرا شیوہ نہیں ہے۔" ان کا یہ درس ۹½ بجے تک جاری رہتا ہے۔ جب کہ بیشتر لوگ اس وقت سونے کی تیاری کر رہے ہوتے ہیں طلبہ پڑھائی میں مصروف ہوتے ہیں اور فلموں کے شوقین حضرات ٹی وی پہ یکے بعد دیگرے بھارت کی دو دو فلمیں دیکھنے میں مگن ہوتے ہیں۔

م۔ش

لاہور سے جن دنوں ایک معیاری اور دل کش ہفت روزہ "اقدام" م۔ش اور ممتاز احمد خاں کی زیر ادارت شائع ہوا کرتا تھا یعنی آج سے ۲۵ برس قبل تک، میں اس کے مستقل قلمی معاونین میں شامل تھا۔ تب سے آج تک میاں محمد شفیع المعروف م۔ش سے میرے نیازمندانہ تعلقات قائم ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ "اقدام" میں شائع ہونے والی میری "فوجی کی ڈائری" قارئین نے بہت پسند کی تھی۔ جو میرے چچا عبداللہ خاں کی سچی آپ بیتی تھی۔ اور اگر میں یہ کہوں کہ ہمارے پریس میں فوجی زندگی کے بارے میں وہ پہلی کہانی تھی جو عوام کے سامنے آئی تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا چنانچہ م۔ش نے اس کہانی پر میری بہت حوصلہ افزائی فرمائی تھی۔ افسوس ہے کہ اس کی صرف دو قسطیں ہی شائع ہوتی تھیں کہ اس طویل اور دلچسپ داستان کا مسودہ کہیں گر گیا اور بعدازاں حالات نے مجھے اجازت نہ دی کہ میں چچا سے دوبارہ اس کے نوٹس لیتا تاآنکہ وہ ہمیشہ کے لئے اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔

م۔ش طویل عرصے سے صحافت میں ہیں بلکہ اگر انہیں صحافت کے آثار قدیمہ کا جیتا جاگتا مجسمہ کہا جائے تو چنداں مضائقہ نہ ہوگا۔ اس دوران وہ انقلاباتِ زمانہ کے طفیل اِدھر سے اُدھر جاتے رہے۔ "سول اینڈ ملٹری گزٹ" میں رہے۔ "زمیندار" سے ان کا تعلق رہا۔ "نوائے وقت" میں برسوں ان کی ڈائری شائع ہوتی رہی۔ علامہ اقبال کے پرائیویٹ سیکرٹری کے فرائض انہوں نے سرانجام دیئے اور خدا جانے کتنے مضمون اور ڈائریاں ان کے قلم سے نکلیں۔ ان کے پریس کی مشینری آہستہ آہستہ معدوم ہوتی چلی گئی مگر م۔ش کی وضعداری میں کوئی فرق نہ آیا۔ وہی منحنی جسم، وہی انکساری، قلم کی وہی جولانی اور معلومات کا وہی ذخیرہ

ایک روز راستے میں مل گئے۔ حال احوال پوچھا جب یہ پتہ چلا کہ میں بے کاری اور کڑکی کا اسیر ہوں تو فوراً کہنے لگے

اوتوں آجانویں نو وجے تک میٹوں پریس وِچ مِل لویں۔ سب ٹھیک ہو جاؤ گا گھبراویں نا"

میں نو بجے تک ان کے پریس میں ان سے نہ مِل سکا کہ دس بجے سے قبل وہاں پہنچنا ممکن ہی نہ تھا لیکن اِن کی اس "ہلا شیری" نے مجھے حالات سے لڑجانے کا حوصلہ بخشا:-

لکشمی چوک

میں ریہڑی پر جراب بنیان اور تولیے بیچنے والا انوار انجم بی اے کا سٹوڈنٹ ہے۔ اپنے تعلیمی اور گھریلو اخراجات پورے کرنے کے لئے وہ کالج سے واپسی کے بعد ریہڑی لگاتا رہا ہے۔ دو تین روز ہوتے میں اس سے ملنے کے لئے گیا تو اس کی ریہڑی پر اس جیسا ہی گورا چٹا، دُبلا پتلا نوجوان کھڑا تھا۔ میں نے پُوچھا "انوار انجم کہاں ہے" کہنے لگا کہ وہ تو راولپنڈی چلا گیا ہے۔ میں اس کا چھوٹا بھائی ہوں۔ معلوم ہوا کہ وہ سکول میں پڑھتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ محنت و مشقت سے اپنے بھائی کی طرح حلال کی روزی کمانے میں مصروف ہو گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ انوار انجم اور اس کے خاندان میں صحیح مسلمان کا خون گردش کرتا ہے کہ محنت و مشقت سے جی چرانے کی ان کو عادت نہیں :-

ماجد الباقری

جدید شاعری میں اپنی عمر کی طرح پرانا اور تجربہ کار ہے ادب کی تمام اصناف بالخصوص شاعری کا انفارمیشن آفیسر ہے گنتی کے ان چند مشہور شعراء میں سے ہے جن کی وضع قطع سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کیا ہیں؟ اپنے عمدہ دماغ کی حفاظت کے لئے اس نے حسین اور بے حد سفید زلفوں کی باندیاں رکھی ہوئی ہیں۔ جو اس کے یونانی فاتحین سے ملتے جلتے چہرے کے اطراف میں رقصاں رہتی ہیں۔ اہلِ زبان ہے اور الفاظ کے برمحل اور باموقع استعمال پر قدرت رکھتا ہے جب کبھی یوپی کے مخصوص لہجے میں پنجابی کے محاورے ادا کرتا ہے تو سننے والے کو بے حد لطف آتا ہے۔ اپنے خلاف کی جانے والی سازشوں کی بو کو وقت سے بہت پہلے ہی اپنی ستواں ناک سے سونگھ کر ان کا جوڑ توڑ کر دیتا ہے۔ اس کی ضخیم بیاض سے میں دو شعر نقل کر سکا اور دو ہی غزلیں، جو یہ ہیں۔

سچی ضرورتوں کی زباں گنگ ہو گئی
پوری صدی کا جھوٹ ملا قال وقیل میں

سورج ہے ایک داغ گھٹاؤں کی پیٹھ پر
جگنو بھی اک شگاف ہے شب کی فصیل میں

(۱)

لفظ کی چادر ہٹی اوراق ننگے ہو گئے
کورے کاغذ کے بدن پر رینگتے ہیں دائرے

اپنے بچپن کی مجھے تصویر دے کر ہنس پڑی
میں نے پوچھا تھا بتا اب قربتوں کے فاصلے

کتنا سچ ہے ایک قبرستان میں چڑیوں کا شور
مُردہ تحریروں سے بہتر ہیں یہ زندہ حاشیے

اب مجھے دیکھو نہ ڈالو گھورتی جیبوں میں ہاتھ
کاش اس تصویر کو تم دُور سے پہچانتے

صُبح ہوتے ہی نکل جائینگے جنگل کی طرف!
رات بھر بیٹھے رہیں گے میرے گھر میں راستے

آپ کے ہمراہ سب کچھ لے چلا ہوں اپنے ساتھ
میرے بچوں کا جو حق ہے وہ تو دینے چاہیئے

ایک ریہرسل کی طرح گزُری ہے ساری زندگی
کب حقیقت بن کے ظاہر ہوں گے دُنیا کے مزے

ایک مرکز پر سمٹتا پھیلتا ہوں رات دِن
جس قدر آنکھیں ہیں ماجدؔ اس قدر ہیں زاویے

(۲)

جب پلک جھپکے تو منظر کا ورق بن جائے ہے!
دِل میں کچھ آئے نظر باھر نظر کچھ آئے ہے

چمپّا کا سیدھا پیڑ ہے بوتو تو جھکتا جاتا ہے
ہائے چھونے کی تمنّا جو مجھے تڑپائے ہے

سردیوں کی لمبی راتیں اوڑھ کر سو جائے ہے
دِن کے سورج کے خیالوں ہی سے دل گرمائے ہے

یار کی خوشبو سے اَپنے جسم کو مہکائے ہے
وہ پری پیکر جو میرے نام سے شرمائے ہے

ہر گھڑی ہر آن بجلی کی طرح لہراتے ہے
میری کچّی کوٹھری میں جھانک کر رہ جائے ہے

ذات کے غاروں میں چھپ کر ہی کوئی بہلائے ہے
روشنی میں جسم کی خواہش مجھے لے آئے ہے

چوڑیوں کی بانسری پر راگ ماجدؔ گائے ہے
گھپ اندھیرے میں صدا اس کی بدن بن جائے ہے

ماسٹر غلام رسُول

جہلم میں آفسٹ اور لیتھو پریس بنانے میں شہرت کی حامل سعید انڈسٹریز کے مدار المہام ماسٹر غلام رسُول جن دنوں پرائمری مدرسے میں پڑھا کرتے تھے۔ ان کے راستے میں ایک "ہینڈی پریس" پر چھپائی کا کام ہوتا تھا۔ ننھا غلام رسُول اس چھوٹی سی مشین اور اس کی کارکردگی کو بغور دیکھنے کے لئے پہروں وہاں کھڑا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ گھر والے اکثر اس کی تلاش میں وہاں پہنچ جاتے اور اسے سرزنش کرنے کے بعد اپنے ہمراہ پکڑ لاتے تھے۔ ایک روز اس نے لکڑی کو رگڑ کر "ہینڈی پریس" سے ملتی جلتی داب بنائی اور وہ کالی سیاہی جس سے وُہ اپنی تختی لکھا کرتا تھا۔ اس میں انڈیل کر کاغذ پر عجیب و غریب حروف بنانے میں کامیابی حاصل کر لی۔ پھر اس کے بعد جوں جوں غلام رسُول بڑا ہوتا چلا گیا۔ لکڑی کی یہ داب بھی جوانی کی جانب قدم بڑھا کر لوہے کی مشین میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ جب غلام رسُول اپنے فن میں طاق ہو کر ماسٹر کہلانے لگا تو اس کی بنائی ہوئی پرنٹنگ مشین نہ صرف ملک کے اندر بلکہ بیرونی ممالک میں بھی منگوائی جانے لگی۔ پھر وہ دِن بھی آیا کہ پاکستان کا شاذ ہی کوئی اخبار اور طباعتی ادارہ ایسا ہو گا جس نے سعید انڈسٹریز سے پرنٹنگ مشینری نہ منگوائی ہو۔ ماسٹر غلام رسول بلاشبہ ایک ایسا خلّاق ذہین جینیس اور خوش قسمت ترین انسان ہے جسے اپنے اندر کے فن کار کو جلا دینے کے مواقع میسّر آئے۔ ورنہ اکثر جینیئس یہاں گھُٹ کر مر جاتے ہیں۔

مبشر احمد راجیکی

حضرت مولوی غلام رسول راجیکی کے صاحبزادے ہیں۔ علم و ادب، تصوف، شاعری اور فلسفہ اس گھرانے کا ورثہ اور خاصہ ہیں۔ مبشرؔ کے ایک مرحوم بھائی مصلحؔ کا کلام پڑھنے کی چیز ہے۔ مبشرؔ کو بھی اللہ تعالیٰ نے ہمہ صفت موصوف بنایا ہے۔ فارسی اور اُردو میں کہتا ہے اور اتنا خوب کہتا ہے کہ پڑھنے والا وجد میں آجاتا ہے اس کی شاعری کا ایک وصف یہ ہے کہ اس کی تشبیہات اور استعاروں میں رُوحانی جذب وکیف پوری مہارت سے شامل ہوتا ہے جب کہ الفاظ بے حد سادہ اور تراکیب عام فہم ہوتی ہیں۔ وہ صاحب حال بھی ہے اور صاحب قال بھی۔ الفقر فخری کی چلتی پھرتی تصویر ہے۔ جیب میں اگر کچھ ہو تو اس وقت تک اسے چین نصیب نہ ہوگا۔ جب تک دوستوں، مہمانوں اور عزیزوں کی خاطر مدارت پر سب صرف نہ ہوجائے۔ جیب خالی ہو تو کسی کو پتہ نہیں چلنے دیتا۔ البتہ اس حالت میں دُوسروں کو تنقید کی "چونڈی" بلکہ "چونڈیاں" بھرتا ہے تاکہ وہ بور ہو کر یا ناراض ہو کر خود ہی چلے جائیں۔ کسی آیت قرآنی یا شعر کی تفسیر بیان کرتا ہے تو وہ اتنی فصیح و بلیغ اور انسانی نفسیات کے قریب ہوتی ہے کہ سننے والا بے اختیار عش عش کر اُٹھتا ہے اس کا حافظہ بلا کا ہے۔ اپنے بیان کی معقولیت ثابت کرنے اور تاثر کو بڑھانے کے لئے اکثر بزرگوں کے اقوال اور بلند پایہ اشعار کو نہایت برمحل اور باموقع استعمال کرنے کے سلسلے میں بھی اسے قدرت نے وہ مخصوص ملکہ عطا کر رکھا ہے جو زمانے کی عالم و فاضل ہستیوں میں پایا جاتا ہے اور جس کی بدولت وُہ

اُپنے معاصرین میں ممتاز ہوتے ہیں۔ نظم و نثر دونوں پر یکساں حاوی و قابض ہے۔ دوسروں کے کلام کی اصلاح چٹکیوں میں کر دینا مبشر کے سوا بہت کم اساتذہ میں دیکھنے میں آیا ہے۔ خود اکثر چھوٹی بحر میں کہتا ہے اور آمد کے دنوں میں موسلا دھار بارش برسانے والا بادل بن جاتا ہے۔

گاجر کا حلوہ مبشر کی پسندیدہ شیرینی ہے۔ پیسے جیب میں ہوں تب بھی اکیلے میں کھانا اس کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ محض گاجر کا حلوہ کھانے کے لئے اسے دو چار دوست تلاش کرنے پڑتے ہیں اور وہ یوں اِدھر اُدھر پھرتا ہے جیسے اس کی قیمتی چیز کھو گئی ہو۔ اگر اسے کوئی شکایت ہو تو وہ برملا اس کا اظہار کر دیتا ہے خواہ اس کے نتیجے میں وہ دوست منہ بسور کر ہی کیوں نہ رہ جائے۔ لیکن جہاں بے تکلفی نہیں ہوتی وہاں اس کا رکھ رکھاؤ اور خوش سلیقگی قابلِ دید اور قابلِ داد ہوتی ہے۔ صوفیانہ وضع قطع اور مسلک کی حامل، عالم فاضل اور شاعری میں منجھی ہوئی یہ شخصیت اپنی مقناطیسی صفات کی بدولت پہلی ہی نشست میں ہی اجنبی مخاطب کے دل میں گھر کر لیتی ہے۔

مجید نظامی

"نوائے وقت" جو آج ایک بہت بڑا ادارہ اور صحافت کی تربیت گاہ ہے جب میں اس میں آیا تو اس کے مالی حالات دگرگوں تھے۔ رانا نور پرویز جنرل مینجر سے جب میں ملا اور ان سے بطور سب ایڈیٹر "نوائے وقت" میں کام کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو انہوں نے مجھے مشورہ دیا کہ چونکہ "نوائے وقت" کو ایک اکاؤنٹنٹ کی ضرورت ہے اور میں یہ کام بخوبی کر سکتا ہوں۔ لہٰذا مجھے بطور اکاؤنٹنٹ ہی کام کرنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے اکاؤنٹنٹ کی حیثیت سے "نوائے وقت" میں اپنے کام کا آغاز کر دیا اور یوں ادارے کے مدار المہام یعنی مجید نظامی کو انتہائی قریب سے دیکھنے اور انہیں سمجھنے کا طویل موقع ملا۔

مجید نظامی اپنے برادر اکبر حمید نظامی کی زندگی کے آخری دنوں میں لندن میں زیر تعلیم تھے۔ اِن دنوں ان کے ڈسپیچ "نوائے وقت" میں شائع ہوا کرتے تھے ان کے ان "مکتوب لندن" کی خوبی یہ تھی کہ اس کی تحریر بے حد شگفتہ اور طرز بیان نادر تھا۔ اپنی اس حیثیت سے "مجید نظامی" کا نام اخباری برادری اور قارئین میں خاصی حد تک معروف ہوا۔ دریں اثناء حمید نظامی اپنے کم سن بچوں اور مردانہ عزم رکھنے والی اہلیہ محترمہ محمودہ بیگم اپنے عزیزوں اور دوستوں کو سوگوار چھوڑ کر انتقال کر گئے۔ اور یوں "نوائے وقت" کے جملہ امور مجید نظامی کے زیر نگرانی آ گئے۔

ابتدائی چند تکلیف دہ برسوں کو قطع نظر کرتے ہوئے مجید نظامی اپنی خداداد انتظامی صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے "نوائے وقت" کو ایک عظیم اور وسیع ادارے میں تبدیل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم ۱۹۶۹ء تک کارکنوں کو تنخواہیں بالاقساط

ہی ملتی رہیں۔ حالات میں خوشگوار تبدیلی کے آثار پیدا ہو رہے تھے کہ اچانک ایک روز ہمیں پتہ چلا کہ مجید نظامی نوائے وقت سے الگ ہو گئے ہیں اور اب دفتر کے جملہ امور بیگم حمید نظامی کے زیر نگرانی طے پائیں گے جن کی نیابت ان کے صاحبزادے شعیب نظامی کریں گے۔ بیگم صاحبہ جن دنوں اپنے مرحوم خاوند کی ڈائریوں اور یادداشتوں کو کھنگال رہی تھیں تاکہ ان کی مدد سے حمید نظامی کے سوانح و افکار پر مشتمل کتاب شائع کی جا سکے۔ مجھے کچھ عرصہ تک ان کی زیر ہدایات ان یادداشتوں کو جمع کرنے کا موقع ملا تھا اور میری دانست میں وہ بے حد سمجھدار اور معاملے کی تہہ تک پہنچنے کی خوبیوں سے آراستہ تھیں اور میرے لئے مجید نظامی کے بعد "نوائے وقت" میں کام کرنے میں کوئی دقت نہ تھی لیکن مجید نظامی کے ساتھ کام کرنے میں جو رُوحانی لذت نصیب ہوتی تھی۔ اس نے مجبور کیا کہ میں بھی ان کے ساتھ ہی یہاں سے رخصت ہو جاؤں۔ چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا اور "ندائے ملت" نکالنے والوں میں صف اول میں جا کھڑا ہوا۔ ندائے ملت نکلا اور خوب نکلا۔ پوری پارٹی کو سخت محنت کرنا پڑی اور بالآخر جب کامیابی نے ہمارے قدم چومے تو پتہ چلا کہ "ندائے ملت لمیٹڈ" نے "نوائے وقت" اخبار خرید لیا ہے اور یوں ہمیں پویلین کی جانب واپس آنا پڑا۔ اس کے بعد "نوائے وقت" نے ترقی کی سیڑھیاں عبور کر کے نیا ریکارڈ قائم کرنے کے سلسلے کا آغاز کیا اس دوبارہ واپسی کے سال ڈیڑھ سال بعد میں ایک چھوٹی سی بات پر دل برداشتہ ہو کر چلا آیا

اس علیحدگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ میری طبیعت لکھنے لکھانے کی جانب زیادہ مائل ہو رہی تھی اور میں دو دونی چار کے چکر سے نکلنا چاہتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں فاقے کرنا چاہتا تھا اور جیسا کہ لکھ چکا ہوں، رانا صاحب کے کہنے پر اکاؤنٹنٹ بن گیا تھا اور اس عہدے پر جب تک میں فائز رہا۔ میں نے پوری محنت، دیانت اور فرض شناسی سے کام کرتا رہا۔ لیکن وہ نامراد صحافی یا رائٹر جو میرے اندر بیٹھا ہوا

تھا۔ اس نے مجھے نچلا نہ رہنے دیا اور میں نے ایک مستقل کالم "گفتنی و ناگفتنی" کے عنوان سے لکھنا شروع کیا۔ جسے مجید نظامی نے کمالِ مہربانی سے شائع کرنے کی اجازت دی۔ میرا یہ کالم بعد ازاں "ندائے ملت" میں بھی شائع ہوتا رہا اور یوں میرے لکھنے لکھانے کا سلسلہ جاری رہا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ میں ایڈیٹوریل میں کام کرنا چاہتا تھا۔ دریں اثناء انتظامیہ کے رویہ سے بددل ہو کر میں نے ادارے سے ہی کنارہ کشی کر لی۔

مجید نظامی میں کئی ایسی خوبیاں ہیں جو بہت کم اِنسانوں میں پائی جاتی ہیں وہ ایک اچھے منتظم اور اخبار نویس ہی نہیں۔ قابلِ رشک دوست اور انتہائی خدا پرست اور عاشقِ رسول ؐ ہیں۔ جب "نوائے وقت" غربت کا شکار تھا تب بھی وہ منکسر المزاج تھے اور اب جب کہ "نوائے وقت" پر ہُن برستا ہے تب بھی منکسر المزاج ہیں۔ البتہ چند واضح تبدیلیاں ضرور آ گئی ہیں ان کے اٹھنے بیٹھنے اور پہننے کے آداب بدل گئے ہیں۔ اب ہر شخص جب چاہے ان کے کمرے میں داخل نہیں ہو سکتا۔ کمرے کی وضع قطع اور فرنیچر میں بھی شاہانہ پن جھلکنے لگا ہے۔ ان کا مزاج پہلے ہی بے حد شاہانہ ہے۔ دِل چاہے تو جان تک دوسرے کو دے دیں اور کبھی انکار کر دیں تو پرِکاہ بھی نہ دیں۔ انسانی ہمدردی کا جذبہ بھی ان کے اندر موجود ہے اور وہ خلقِ خدا کا خیال رکھنے اور مالی امداد دینے کی خاموش کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ گو کبھی کبھی ان کا پیمانہ اور اندازہ غلط ہو جاتا ہے۔ جس کو کم کی ضرورت ہوتی ہے اسے اس سے کہیں زیادہ دے دیتے ہیں۔ جسے مزید کی احتیاج ہوتی ہے ہاں عابد و زاہد مجید نظامی میں ایک بشری کمزوری بھی ہے جسے اکثر دوستوں اور ان کے رفقائے کار اور شاید انہوں نے خود بھی اسے محسوس کیا ہو گا کہ جس طرح ان کی جان و مال ان کی اپنی نہیں۔ بعینہٖ اسی طرح اِن کے کان بھی ان

کے اپنے نہیں - چرب زبان، دروغ گو اور شکائتی رُقعے ان کی اِس خامی سے بھرپُور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے ہیں جس کی وجہ سے اِن کے بے حد مخلص اور دیانت دار رفقائے کار اور ملازمین ہمیشہ متفکر و متردد رہتے ہیں - اس بشری خامی سے قطع نظر مجید نظامی خوبیوں کی پوٹ ہیں، جن کے ساتھ کام کرنے والا اگر مالی منفعت یا اقتصادی مجبوریوں سے بے نیاز ہو تو کیا ہی کہنے - لُطف زندگی دوبالا ہو جاتا ہے - اِدھر کسی کے کان بھرنے کے نتیجے میں انہوں نے کسی کی گوشمالی کی - وُہ شخص آزُردہ خاطر، سراسیمگی کی حالت میں گُم سم اپنی سیٹ پر آ بیٹھا - ادھر مجید نظامی نے اُسے واپس بلوالیا "سچی بات یہ ہے کہ مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں - میرے دل میں آپ کی بڑی قدر ہے" ان کے مسکراتے چہرے سے یہ جُملہ سنتے ہی سارے دلدّر دُور ہو جاتے ہیں:

محمّد ابراہیم

چنیوٹ بورڈنگ ہاؤس میں ہمارے ٹیوٹر دینیات کے استاد محترم مولوی محمد ابراہیم بھامبڑی تھے۔ جب کہ سپرنٹنڈنٹ اور حساب کے استاد جناب محمد ابراہیم ناصر۔ انگریزی کے استاد جناب محمد ابراہیم جمونی اور سیکنڈ ہیڈ ماسٹر صوفی محمد ابراہیم تھے۔ ان چار ابراہام کے علاوہ فارسی کے استاد رحمانی صاحب مرحوم اور ماسٹر ضیاء الدین مرحوم تھے۔ اردو چودھری غلام رسُول اور محترم مرزا عنایت اللہ مرحوم پڑھایا کرتے تھے۔ کبھی کبھی مولوی عبد القدیر صاحب بھی کوئی پیریڈ لے لیتے تھے۔ ہیڈ ماسٹر بلند پایہ ہستی محترم سید محمود اللہ شاہ صاحب تھے۔

جگہ کی قلت کی وجہ سے بورڈنگ تین حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ کے انچارج ٹیوٹر مرزا عنایت اللہ تھے۔ دوسرے کے بھامبڑی صاحب اور تیسرا بچوں کا ہوسٹل تھا۔ جس کے دوامی انچارج محترم اللہ بخش صاحب زراعت ماسٹر تھے۔ کچھ عرصہ میں مرزا عنایت اللہ کے زیر سایہ رہا۔ جو بہت ہی شفیق اور محبت کرنے والے استاد اور مربّی تھے۔ بعد ازاں "ترقی پاکر" بھامبڑی صاحب کی کفالت میں آگیا۔ عصر کی نماز کے بعد کئی طالب علم بھامبڑی صاحب سے دُودھ کی پرچیاں لکھواکر بابا فضل احمد سے دودھ اور بن کھاتے تھے۔

ایک روز میں نے ان کی خدمت میں عرض کی کہ جناب آدھ سیر دُودھ کی پرچی مجھے بھی بنادیں۔ فرمانے لگے کہ ان کے والدین تو اِن کو ڈھیروں روپیہ بھجواتے ہیں تمہارا تو پہلے ہی بورڈنگ کا اصل خرچ پُورا نہیں ہوتا۔ میں نے بہت منت سماجت کی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوتے۔ دریں اثناء وہ لڑکوں کو پرچیاں بنا بنا کر دیتے رہے اور ان کے دستخطوں کو جو کاغذ کے ایک جانب سے شروع ہو کر دوسری جانب کہیں جاکر ختم ہوتے تھے۔ بغور دیکھتا رہا۔ جب انہوں نے میری

آہ وزاری کی کوئی پروانہ کی تو میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا آیا۔ یہاں میں نے ایک کاغذ پر بابا فضل احمد کے نام ویسی ہی پرچی تیار کی اور اس پر بھامبڑی صاحب کے طویل و عریض دستخط کر کے آدھ سیر دُودھ اور بند کھا پی لیا اور پھر جب بھی میرے جسم میں کیلشیم کی کمی ہوتی۔ میں اسے پُورا کر لیتا۔ کوئی دو تین ماہ کے بعد ایک روز جب بھامبڑی صاحب دُودھ کی پرچیاں جاری کر رہے تھے۔ میں نے ایک پرچی جاری کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے پھر مجھے وہی جواب دیا کہ تمہیں پرچی نہیں مل سکتی۔ میں نے کہا کہ اچھا مولوی صاحب میں جیسے پہلے پیا کرتا ہوں ویسے ہی پی لوں گا۔ اس پر انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ لیا اور کہنے لگے۔ بتاؤ پہلے کہاں سے دودھ پیتے ہو۔ میں نے کہا بابا فضل احمد سے۔ کہنے لگے وہ کیسے، میں نے کہا۔ پرچی دے کر۔ اس پر انہوں نے یوسف کلرک سے پچھلے مہینوں کی پرچیاں منگوالیں۔ میری تیار کی ہوئی پرچیوں کو بغور دیکھا اور فرمانے لگے۔ کم بخت تم نے میرے دستخط مجھ سے کیسے کروالئے۔ میں نے کہا جناب یہ دستخط تو میں نے خود کئے ہیں آپ سے نہیں کروائے اس پر وہ بہت ناراض ہوئے اور انہوں نے مجھے دو بید رسید کئے۔ خیر میں اپنے ہاتھ اور تقدیر کو سہلاتا وہاں سے آگیا۔ رات بھر میرے ہاتھ میں سخت تکلیف رہی۔ صبح ہی صبح بھامبڑی صاحب آ گئے۔ میں انہیں دیکھ کر سخت ڈرا کہ شاید مزید شامت آئے گی۔ مگر انہوں نے آتے ہی میرا سُوجا ہُوا ہاتھ دیکھا اور کہنے لگے "چلو میرے ساتھ۔ رات بھر منیر (ان کا بیٹا جو اِن دنوں بہت کم سِن تھا اور ان دنوں اس کی طبیعت ناساز تھی) کے ساتھ میں بھی روتا اور جاگتا رہا ہوں" مجھے بابا فضل احمد کے پاس لے گئے کہ یہ لڑکا جب چاہے اسے دُودھ دے دیا کریں اور میرے حساب میں لکھ دیا کریں۔

ایک بار روزوں کی آمد آمد تھی۔ میرا روم فیلو حمید احمد ایک ڈاکٹر کا بیٹا اور خاصہ خوش حال تھا۔ میں نے اسے کہا کہ اس کے پاس گھڑی ہے رمضان میں وہ مجھے سحری کے وقت جگا دیا کرے۔ اس نے شاید از راہِ مذاق مجھ سے کہا "گھڑی اپنی ہونی چاہیئے"، کیا تم ایک گھڑی نہیں لے سکتے۔ میں نے کہا حمید میں گھڑی تو نہیں۔ مگر مٹی کا گھڑا ضرور لے سکتا ہوں۔ بظاہر بات آئی گئی ہوگئی۔ مگر میرے دل میں ایک زخم سا لگ گیا۔ انہی دنوں میرے ایک بزرگ محترم حافظ قدرت اللہ صاحب ہالینڈ سے بمع بچگان آئے۔ میں ان سے ملنے کے لئے ان کے گھر چلا گیا وہ بہت محبت اور پیار سے پیش آئے۔ ان کے کمرے میں ایک خوب صورت گھڑی لٹکی ہوئی تھی۔ اُسے دیکھ کر مجھے ڈاکٹر حمید کی باتیں یاد آگئیں زخمِ دل ہرا ہوگیا اور میں نے خاموشی کے ساتھ وہ گھڑی اٹھا کر جیب میں ڈال لی۔ پروگرام یہ بنایا کہ رمضان کے بعد اسے خاموشی کے ساتھ یہاں لٹکا دوں گا اور یوں کسی کو پتہ بھی نہ چلے گا۔ میں واپس ہوسٹل آگیا۔ اور آتے ہی ڈاکٹر حمید کو گھڑی دکھا کر کہا کہ یہ لو میں اپنی گھڑی لے آیا ہوں۔ دو چار روز کے بعد مجھے بھامبڑی صاحب نے بلایا اور کہنے لگے سنا ہے تمہارے پاس نہایت عمدہ گھڑی ہے۔ میں نے کہا جی ہاں۔ فرمانے لگے۔ ہمیں بھی تو دکھاؤ۔ میں بھاگم بھاگ کمرے تک گیا اور گھڑی لاکر اِن کو دکھا دی انہوں نے گھڑی ہاتھ میں لیتے ہی آواز دی۔ حافظ صاحب تشریف لے آئیں ناگاہ ساتھ والے کمرے سے حافظ قدرت اللہ صاحب برآمد ہوگئے۔ بھامبڑی صاحب نے گھڑی ان کو دے دی۔ مجھے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ لیکن حافظ صاحب نے جن نظروں سے مجھے دیکھا اس سے مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اس واقعہ کے بعد آج تک میں حافظ صاحب سے نظریں نہیں ملا سکا۔

محمد ابراہیم ناصر ہمارے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ انہوں نے مجھے جیومیٹری کی ایک خوبصورت مجلد کتاب اپنے دستخطوں سے بالکل مفت دی اور فرمایا کہ تم حساب میں بہت اچھے ہو اس کتاب کو میری جانب سے انعام سمجھو۔ دو سال کے بعد جب میٹرک کا امتحان ہو

گیا تو میں نے وہ کتاب جو بہت اچھی حالت میں تھی اور آئندہ بھی کورس میں شامل تھی ناصر صاحب کی خدمت میں بدیں الفاظ پیش کی۔ کہ جناب میں نے اس سے فائدہ اٹھا لیا ہے اب آئندہ میں یہ کسی مستحق اور ذہین طالب علم کو دینے کے لئے آپ کی خدمت میں لے آیا ہوں۔ انہوں نے اپنے دستخطوں پر اُنگلی رکھتے ہوئے پُوچھا کہ یہ دستخط کس کے ہیں۔ میں نے کہا" کہ یہ جناب نے ہوسٹل کے دفتر میں ثبت فرمائے تھے۔ کہنے لگے بالکل غلط۔ یہ میرے دستخط نہیں ہیں جب میں نے اصرار کیا تو وہ سخت غصے میں آگئے۔ حالانکہ انہیں "غصّے" کی حالت میں مَیں نے بہُت کم دیکھا تھا۔ خیر کتاب تو انہوں نے لے کر رکھ دی۔ مگر مجھُے اپنے کمرے سے نکل جانے کا حکُم دیا۔ عشار کی نماز کے بعد انہوں نے مجھُے اُپنے پاس بلایا۔ محبّت بھرے لہجے میں کہنے لگے کہ صبح میں نے تمہیں بہت رنج دیا گھر جا کر میں نے دو سال پہلے کے اپنے دستخط دیکھے تو مجھ پر یہ حقیقت کھُلی کہ وہ فی الواقع میرے ہی دستخط ہیں جو اَب بہت تبدیل ہو گئے ہیں یہ جمُلے کہے اور اس کے ساتھ ہی ان کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ پڑے۔

انہی ناصر صاحب سے متعلق ایک اور واقعہ ہے انہوں نے ٹائپ کرتے وقت میٹرک کے داخلہ فارم میں میری تاریخ پیدائش میں غلطی سے دو سال کا فرق ڈال دیا اور یوں میری عمر اصل عمر سے دو سال زائد ہو گئی۔ جب گزٹ شائع ہوا اور میں نے اس غلطی کو نوٹ کرنے کے بعد ان سے بات کی تو کہنے لگے یہ سب کچھ میری غلطی کی وجہ سے ہوا ہے اس کی جو سزا ہے مجھے دے دو" انہوں نے اس طرح رقّت کے ساتھ یہ جملے ادا کئے کہ میں نے تہیہ کر لیا کہ اس غلطی کی کبھی تصیح کروانے کی کوشش نہیں کروں گا کہ اس طرح مجھُے اپنے ایک استاد کی غلطی تسلیم کرنی پڑے گی۔ واہ واہ کیا استاد ہوتے تھے۔ شاگردوں کو سزا دینے کے بعد رات بھر روتے رہتے تھے۔ اپنی غلطیوں اور خامیوں کا کھُلے دل سے اعتراف کرتے تھے اور یوں اپنے شاگردوں کے دلوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قبضہ جما لیتے تھے ٭

محمود انورؔ عاشی

محمد افضل نے پہلے تو اپنا تخلص قمرؔ کیا۔ مگر اس کی تسلی نہ ہوئی اور اس نے قلب ماہیت کر لی یعنی محمود انور عاشی بن گیا۔ اپنے برادرِ خورد بشارت احمد ثاقبؔ کو ساتھ ملا کر شاندار طریقے سے اپنی اکیڈیمی چلائیؔ۔ یہاں دونوں بھائیوں نے خوب شعرو شاعری کی اور جی بھر کر غزلیں کہیں۔ مگر آسمان کو ان کا یہ سکونِ دل ایک آنکھ نہ بھایا۔ ان کی شرافت، نیکیؔ، دوستی اور کاروبار کچھ ایسے لوگوں کے ہاتھوں لُٹ گئےؔ جو سادہ لوح نیک دل شہریوں کو بیرون بھجوانے کے سُنہرے جھُوٹے خواب دکھانے کے عادی ہیں۔

محمد اکرم طاہر

بیڈن روڈ پر ملک رفیق کی ریڈیو کی دوکان پر جو رات کو ہماری جائے پناہ ہوتی تھی۔ جن تین چار دوستوں سے واسطہ پڑا ان میں ایک اکرم طاہر تھا دوسرا گوگی۔ تیسرا مودی شاہ اور چوتھا استاد

اکرم طاہر پہلے کہیں ملازمت کرتا تھا۔ وہاں سے مالکان نے پیسے نہ دیئے تو وہ اپنا اور مالکوں کا وہ سامان جو اس کے قبضے میں تھا اٹھا لایا۔ گوگی کبھی ایک کام کرتا کبھی دوسرا۔ آج رکشہ لے رہا ہے۔ دوسرے دن ٹیکسی بنا رہا ہے۔ طبیعت اور مزاج میں جتنی نرمی تھی۔ اتنا ہی اکھڑ اور تند تھا۔ اکثر لوگ اس کی درشتی کی وجہ سے خوف زدہ رہتے تھے۔ جب کہ ہم جیسے اس کی نرم خوئی کی بنا پر اس سے لگاؤ رکھتے تھے۔ گوگی میں ایک عظیم خوبی یہ تھی اور ہے کہ وہ اپنی ماں کا اتنا ادب کرتا ہے اور اس سے اتنا دبتا ہے۔ جتنا ادب ماں کا کرنے کا حکم ہے۔

مودی شاہ اس علاقے کا خوبرو اور رجیدار نوجوان ہے۔ ایک بار ایک فلم سوہنی مہینوال کے موضوع پر بنی تھی۔ اس میں شہزادہ عزت بیگ کے ساتھیوں میں مودی شاہ بھی شامل تھا جو ترکستان کے روایتی لباس میں بے حد نکھر کر سامنے آیا تھا۔

استاد کا اصل نام تو کچھ اور تھا مگر اسی نام سے مشہور تھا۔ اس نے اپنے شاگردوں کو اپنا فن اور شاگردوں نے اسے یہ نام دیا ہے۔ ان سب دوستوں نے بعد ازاں ٹھکانے تبدیل کر لئے۔ گوگی اور ملک رفیق بیرون ملک چلے گئے

مودی شاہ اب بھی اپنے گدرائے ہوئے جسم، شبنمی زلفوں سمیت، عمر خیام کی رباعی بن کر بیڈن روڈ پر مِل جاتا ہے اور کئی کئی پان کھلا کر ناک میں دم کر دیتا ہے استاد نے ایک روز بتایا کہ وہ بے کاری سے تنگ آ چکا ہے۔ پھر ملا تو ٹیچی میں تھا اور یوں اس نے "بے کاری" کا مداوا کر لیا۔

محمد اکرم طاہر کراچی چلا گیا تاکہ وہاں سے ڈھیروں روپیہ کما کر اپنے والدین کو بدو ملہی بھجوا سکے مگر ہوتا یہ ہے کہ ہر ماہ وہ اپنے والد کو خط لکھتا ہے کہ اگر ان کے پاس کچھ پیسے ہوں تو وہ اُسے بھیج دیں۔ جب مجھے اس کا علم ہوا تو مجھے بڑا تاؤ آیا کہ الیکٹریشن کے کام میں وہ اپنی مثال آپ ہے۔ کراچی میں اس فن کی بڑی مانگ اور قدر ہے پھر کیا وجہ ہے کہ وہ وہاں بھی بدحالی کا شکار ہے۔ چنانچہ میں اس کا کھوج لگاتا ہوا طارق روڈ پر واقع "نذیر الیکٹرک سروس" تک جا پہنچا جہاں سے انہوں نے مجھے اکرم کی رہائش گاہ محمود آباد کالونی میں بھجوا دیا۔ پتہ چلا کہ جناب صاحب کی آمدنی کم نہیں ہے مگر خرچ پر کنٹرول نہیں ہو رہا "تنہائی" کے مرض کا علاج کرنے کے لئے فلمیں دیکھتے ہیں۔ ہوٹل بازی کرتے ہیں اور اِدھر اُدھر مارے مارے پھرتے ہیں۔ اندریں حالات جو کماتے ہیں وہ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ مہمان نوازی کے وہ بے حد شائق ہیں۔ پنجاب کا کوئی بھی آدمی ان کی ہمدردی حاصل کر کے ان سے کئی ماہ تک روٹیاں ہی نہیں بوٹیاں بھی کھا سکتا ہے۔ کوئی فقیر مِل جائے تو اس کی حالت پر وہیں رونا شروع کر دیتے ہیں اور جو کچھ پاس ہوتا ہے اسے دے دیتے ہیں جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کم بخت امیر ہو جاتا ہے اور یہ بے چارے فقیر ہو جاتے ہیں جن کو کوئی گھاس بھی نہیں ڈالتا۔

محمدامین

یونائیٹڈ پبلشرز کے مینیجنگ ڈائریکٹر ہیں۔ ڈاکٹر عبد السلام خورشید کے بہنوئی اور مولانا عبدالمجید سالک کے داماد ہیں۔ بے حد علم دوست ہیں لطیفوں کی پوٹ ہیں۔ خود بہت کم ہنستے ہیں۔ ساری کسر دوسروں کو ہنسا کر نکال لیتے ہیں جب دیکھتے ہیں کہ حاضرین یا مخاطب کی ہنسی اور قہقہہ فسٹ گیئر میں جا رہا ہے تو جھٹ سے نیا اور اچھوتا واقعہ اور لطیفہ چھوڑ کر ہنسی کا ایکسی لیٹر دبا دیتے ہیں۔ بڑے بڑے قلمکار اور لکھاری حضرات یہ طے کر کے جاتے ہیں کہ ان کے سنائے ہوئے لطیفوں کو قلمبند کریں گے مگر ان کی محفل میں گلا پھاڑ کر قہقہہ لگانے کے بعد جب لوٹ کر ان کو لکھنے بیٹھتے ہیں تو اپنی کم مائیگی اور مجبوریوں پر رونے لگ جاتے ہیں۔

شیخ محمد امین صاحب کا ادارہ اور اس میں کتابوں کا ذخیرہ بہت بڑا ہے۔ نیک دل اور اپنے ادارے کی طرح "لمیٹڈ" مخیر آدمی ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خیرات سوگوار اور اداس سے اداس طبائع کو "ہنسی کا گول گپا" بنانا ہے۔

محمد حسین انصاری

میجر جنرل (ریٹائرڈ) محمد حسین انصاری ایل ڈی اے کے چیئرمین ہیں۔ بہت غریب پرور، فرض شناس اور محبِ وطن آفیسر ہیں۔ اِن کے عہد میں مستحق غربا کی جتنی شنوائی ہوئی ہے۔ اس کی پہلے کوئی مثال نہیں ملتی۔ انسانی زندگی تجربات اور مشاہدات کی محتاج ہے۔ اس تجربے اور مشاہدات کی روشنی میں میری ذاتی رائے یہی ہے کہ اگر غریبوں، محتاجوں، اور مستحقین کی بات سُن کر ان کے محض پھپھولے ہی پھوڑ دیئے جائیں تو ہمارا معاشرہ بہت حد تک سُدھر سکتا ہے

اپنی اہلیہ کی طویل، پیچیدہ اور مالی بحرانوں میں مبتلا کر دینے والی بیماری نے جب میرا "آشیانہ" بھی چھین لیا اور بچوں کے سر چھپانے کے لئے کوئی جھونپڑا میسر نہ آیا تو میں نے گورنر پنجاب لیفٹیننٹ جنرل سوار خاں کی خدمت لکھا کہ صحافیوں اور قلم کاروں کو حکومت رہائشی سہولتیں، قرضے اور پلاٹ دیتی ہے۔ اس کی اس فیاضانہ پالیسی سے ہمارے کچھ بھائی ضرورت سے زیادہ مُستفید ہوتے ہیں مگر بہت سے ایسے بھی ہیں جنہیں حکومت کی فیاضیوں سے کوئی تعلق نہیں۔ ان میں ایسے صحافی، ادیب اور شاعر بھی ہیں جو حقیقتاً مستحقین میں شامل ہیں۔ مگر وہ خاموش اپنی آگ میں جل رہے ہیں۔ گورنر پنجاب نے میری یہ چھٹی جناب الحاج محمد حسین انصاری کو بھجوادی۔ جنہوں نے اپنا آدمی بھجوا کر مجھے بلوایا اور نہایت شفقت سے میری داستان سُنی اور دستگیری کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی رپورٹ گورنر پنجاب کو بھجوادی۔ جنہوں نے کمال مہربانی سے مجھے ایل ڈی اے کا ایک کوارٹر

الاٹ کرنے کی منظوری دے دی۔ بلاشبہ اِن کوارٹروں میں بال بچوں سمیت رہائش رکھنا بذاتِ خود آفاتِ سماوی کا ایک حصہ ہے مگر بوقت اشد ضرورت سر چھپانے کے لئے جامِ جمشید سے کم بھی نہیں۔

۱۰×۱۰ مکانیت کا یہ کوارٹر جس میں اَب اضافے کے بعد ۱۰×۲۰ کا ایک نیا کمرہ اور چار دیواری وغیرہ میں نے تعمیر کرائی ہے اب گزارے کے لائق ہو گیا ہے مگر اس کی الاٹ منٹ کی داستان بے حد عجیب و غریب ہے۔ میری وُہ چھٹی جس پر مجھے جناب انصاری صاحب نے بلوایا تھا اور جس پر انہوں نے اپنی رپورٹ گورنر پنجاب کو بھجوائی تھی۔ ایل ڈی اے کے شعبہ الاٹمنٹ میں چلی گئی۔ جہاں سے ڈیڑھ ماہ کے بعد یہ جواب موصول ہوا کہ ایل ڈی اے کے پاس نہ تو کوئی پلاٹ ہے اور نہ ہی کوئی کوارٹر۔ جب کبھی ہو گا پھر دیکھا جائے گا۔ دریں اثنار گورنر پنجاب نے مجھے کوارٹر الاٹ کرنے کی منظوری دے دی۔ اب وہاں میری اصل چھٹی کی تلاش شروع ہوئی مگر دفتر کے "ذمہ دار عملہ" کو اس کا کچھ پتہ نہ چل سکا۔ جناب انصاری نے اس کے باوجود گورنر کی منظوری کے مطابق مجھے کوارٹر دینے کا حکم دیا جو مجھے مِل گیا۔ جب میں وہاں پہنچا تو پانی کا ساٹھ فٹ لمبا پائپ کوئی ضرورتمند نکال کر لے جا چکا تھا۔ علاوہ ازیں کوارٹر کی حالت بے حد خستہ و خراب تھی۔ میں نے چیئرمین صاحب کی خدمت میں عرض کیا" کہ پانی کا انتظام نہیں ہے"۔ انہوں نے کمال مہربانی سے پانی وغیرہ کا انتظام کرنے کی ہدایات جاری کیں۔ ایک ہفتہ ہم پانی کے بغیر رہے بعد ازاں کافی رقم خرچ کر کے پائپ اور نل وغیرہ لگوا لیا۔ تاہم میری اس درخواست کا یہ فائدہ ہوا کہ اس کے کوئی ڈیڑھ دو ماہ بعد ایل ڈی اے کا شعبہ عمارات حرکت میں آیا۔ اور اس نے خستہ حال کوارٹروں پر نظرِ کرم کی گو ٹھیکیدارو نے حسبِ عادت مرمت کا کام کم سے کم سیمنٹ اور زیادہ سے زیادہ ریت سے کیا ہے مگر بہرحال کچھ نہ کچھ ہوا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب کچھ جناب انصاری کی ذاتی فرض شناسی اور کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

محمد سلیم

نوائے وقت کے دفتر میں دو سلیم ہیں۔ ایک سلیم گورا چٹا۔ دُوسرا گندمی رنگ کا گورا چٹا سلیم فلسفی ہے۔ ہر وقت کچُھ نہ کچُھ سوچتا رہتا ہے کبھی آفسٹ مشین بنانے کے لئے اس کا دماغ مصروف ہو گا۔ کبھی ہیلی کاپٹر کے پرُزے بنا رہا ہو گا۔ ان میں سے آفسٹ مشین تو اس نے بنالی تھی۔ مگر ہیلی کاپٹر شاید ابھی دماغ میں ہی اُڑ رہا ہے۔ اخبار کے کٹنگ بنا رہا ہو یا بلوں کی پوسٹنگ کر رہا ہو۔ رشید شاہد کے سامنے بیٹھا ہو یا پال کے کمرے میں ہو۔ توحید سے کوئی بات چیت کر رہا ہو یا غسل خانے کی جانب جا رہا ہو اِسکی میکانکی سوچ وہاں سے بہُت دُور کسی ایجاد میں مصروف ہو گی۔ جب وہ اپنی تھیوری کو آخری "ٹچ" دے رہا ہو گا تو خورشید صاحب کے کمرے میں جائے گا وُہ فارغ نہ ہوں گے تو افتخار شاہ سے ہی سہی فلسفیانہ گپ شپ لڑائے گا۔ راستے میں مجھے دیکھ لے گا تو اپنی پھٹیچر سائیکل سے اپنا بے داغ دُھلا ہوُا جسم آرام سے اتارے گا اور بڑے تپاک سے اپنی فِکر کے پھوُل پیش کرے گا۔ اگر کوئی اور نہ ملے تو زوار حسین زیدی کو باغ میں لے جائے گا۔

دُوسرا سلیم اپنے آپ کو میرا شاگرد سمجھتا ہے اور مِلنے جُلنے والوں کو بھی یہ بتاتا ہے اس کے لئے یہی ایک بات سدِ راہ بننے کے لئے کافی ہے کسی مزید گردشِ دوراں کی احتیاج نہیں ؎

محمد شریف خالد

پروفیسر بھی ہے اور وکیل بھی، پروفیسری چھوڑ چکا ہے جب کہ وکالت کا آغاز ہی نہیں کر سکا۔ البتہ کچہری میں ایک درخت کے ساتھ وہ خود اور اس کی ڈگریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ سخت سردیوں میں بھی کرتے پر زیادہ سے زیادہ دو ہاتھ لمبا سویٹر پہنتا ہے۔ حالانکہ چھ فٹ کے لگ بھگ لمبے جسم میں ایک آدھ پسلی سے زائد کوئی ہڈی نہیں رہا گوشت کا سوال تو وہ بے حد مہنگا ہے۔ کئی بچوں کا باپ ہے۔ ایک بھینس اور دو کتے اکثر گھر پر رکھتا ہے جہاں بالعموم فاقے اور تنگدستی کا بسیرا ہے۔ مگر بھینس اور اس کے بچوں کی خوراک اور چارے کی فکر بالالتزام کرتا ہے خواہ بھینس بھی کتوں کی طرح دودھ سے بے نیاز ہی کیوں نہ ہو۔ بہت دردمند اور باحوصلہ انسان ہے۔ تیس چالیس برس قبل ایک سائیکل اس کے ہاتھ لگ گئی تھی اس پر اسے بیٹھتے ہوتے بہت کم دیکھا ہے البتہ اسے ہر جگہ ساتھ لئے پھرتا ہے۔ ایک روز میں نے مشورہ دیا کہ خالد صاحب اب تو اس کا پیچھا چھوڑ دیں اس پر سائیکل پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی کہ بھلا اس عمر میں مجھے کون پوچھے گا۔

تین مقولے جنہیں خالد صاحب "کام کی باتیں" اور یاد رکھنے کی باتیں کہتے ہیں وہ یہ ہیں (۱) الو سے الو کا پٹھا زیادہ قیمتی، کارآمد اور آرام میں ہوتا ہے

(۱۱) بہت اچھا بننا دراصل برا ہوتا ہے۔ IT IS BAD TO BE TOO GOOD

IT IS BETTER TO INFLICT THE FOE THAN TO SUFFER AT HIS HANDS (!!!

دشمن کو کاری ضرب لگانا بہتر ہے نہ کہ اس کے ہاتھوں نقصان اٹھانا

زمینداری میں مہارت تامہ رکھتا ہے۔ لیکن پیسہ نہ ہونے کی وجہ سے زمینیں بھی ہمیشہ دھوکا دے جاتی ہیں۔ علم و ادب سے خاصا شغف رکھتا ہے جس کی بدولت تنگ دستی اس پر حد سے زیادہ لٹّو ہے۔

جب کبھی وہ بہت زیادہ پریشان یا آزردہ خاطر ہو جاتا ہے تو وہ فوری طور پر کوئی لطیفہ بیان کر کے قہقہے لگانے لگتا ہے اس دوران وُہ اپنی ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کو کئی بار کھولنے اور بند کرنے کے بعد انہیں خُشک کرنے کے قابل ہو جاتا ہے اور یوں وہ اپنے "اغمائے سینہ" پر قہقہوں کے "پیند" لگانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ گھر سے جب اس کا بیٹا یہ پیغام لے کر آتا ہے کہ آج کیا پکانا ہے؛ تو وہ سر سے ٹوپی اتار کر ایک طرف رکھ کر اسے دونوں ہاتھوں سے زور زور سے کھجانے لگ جاتا ہے اور کچھ دیر کے بعد اسے کہتا ہے کہ جاؤ "مسور کی دال پکالو" چنانچہ وہ دال لے کر چلا جاتا ہے تو حیرت و استعجاب سے کہتا ہے کہ اس سے بہتر تھا گوشت ہی لے لیتے جس پر پیسے تو دال جتنے ہی خرچ ہونے تھے مگر نہ گلنے کی وجہ سے کل کا دن مزید اسے پکا کر گزارا جا سکتا تھا ؎

محمد ظفر اللہ خاں

چودھری محمد ظفر اللہ خاں دُنیا کے معروف ترین آدمی ہیں جو اپنے اوقات کو پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق صرف کرتے ہیں۔ وکالت، سفارت، عبادت سب شعبوں میں یکساں خلوص نیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ کئی کتابوں کے مصنف ہیں۔ جن میں ضخامت کے لحاظ سے مختصر "میری والدہ" ہے۔ مگر تاثیر کے لحاظ سے نہایت قدآور اور قابلِ تعریف ہے۔ ابھی گزشتہ برس ان کی آپ بیتی "تحدیثِ نعمت" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ سُنا ہے کہ پڑھنے کی چیز ہے۔ شدید خواہش کے باوجود خریدنے کی ہمت آج تک نہ ہو سکی۔

میرے خالو لطیف احمد خاں مرحوم جن سے مجھے بے حد پیار تھا اور جن کے لئے میرے دل میں بے حد احترام تھا۔ کیونکہ وہ میرا بے حد خیال رکھتے تھے۔ وہ ہر سال باالتزام مجھے کرایہ پیشگی بھیج کر اپنے ہاں آنے کا اشتیاق ظاہر کیا کرتے اور میں وہاں جایا کرتا۔ ظفر آباد اسٹیٹ جانے کے لئے حیدر آباد سندھ سے چھوٹی لائن پر سفر کرنا پڑتا تھا۔ حیدر آباد سے چوتھا یا پانچواں ریلوے اسٹیشن ٹنڈو الٰہ یار سے گاڑی ترک کر کے "بس" کا سفر کرنا پڑتا تھا۔ اب اس سڑک اور بس کی حالت شاید تبدیل ہو گئی ہو مگر ۱۹۵۸ء تک یہاں جو بس چلتی تھی۔ اگر اسے اس کی بنانے والی کمپنی چالو حالت میں دیکھ لیتی تو اس کے تمام حصہ داروں کا خوشی کے مارے ہارٹ فیل ہو جاتا۔ بس کے مالک کو نئی کم از کم ایک درجن بسیں اور ڈھیر سا روپیہ انعام میں دے کر ہی بس کو حاصل کیا جاتا اور اسے جرمنی کے کسی چوراہے میں سجا کر لوگوں کو کمپنی کا زندہ کارنامہ دکھایا جاتا۔ جو ڈرائیور اس بس کو چلاتا تھا اس کی مہارت کی داد نہ دینا بھی بخیلی ہے ٹنڈو الٰہ یار سے بشیر آباد چانگ تک ایک راستہ تھا جسے عرف عام میں سڑک کہا جاتا تھا۔ اس کے دونوں سروں پر کہیں کہیں چند اینٹیں مٹی سے سر باہر نکالے نظر آتی تھیں

کھڈے، کھائیاں اور عجیب و غریب موڑ اس سڑک کا مقدر تھیں مگر وہ ڈرائیور اس سو سالہ پُرانے کھٹارے کو تیز رفتاری کے ساتھ اڑائے لئے پھرتا تھا۔ اس بس میں سفر کرنے والی سواریوں کے صبر و تحمل کا ذکر بھی ناگزیر ہے جن کی حالت ان جامنوں سے کہیں بڑھ کر خستہ تھی جن کو "کچھے" میں نمک ملانے کے لئے ڈالا جاتا ہے۔ اکثر بشیر آباد چانگ کے اڈے پر میری پیشوائی کے لئے "گھوڑی" آئی ہوتی تھی۔ جس پر سواری کرنے کا شوق کشاں کشاں مجھے یہاں لانے کی ایک اور بڑی وجہ ہوتا تھا۔ لیکن شومئی قسمت سے اگر ہمارا ٹنڈو الہ یار سے اُڑنے والی "فلائیٹ" لیٹ ہو جاتی یا ریل گاڑی کی وجہ سے میں اس فلائیٹ کو مس کر دیتا اور کسی دوسرے نقل و حمل کے ذریعہ سے چانگ پہنچتا تو لوٹ کا سے ڈیڑھ دو میل پیدل چلنا ہوتا تھا۔ اور یہ سارا راستہ اس زہریلے سانپ سے بھرا پڑا تھا جسے سندھی لوگ "لنڈی" کہتے ہیں۔ اور جو اس علاقے کا خطرناک ترین سانپ شمار ہوتا ہے۔

پہلی بار جب میں اصل راستے کو چھوڑ کر ایک "شارٹ کٹ" کے راستے تین فرلانگ طے کر چکا تو ایک سندھی کسان دوڑ کر میرے پاس آیا اور اس نے سر سے پاؤں تک مجھے بغور دیکھا اور میرے زندہ بچ رہنے پر اتنے تعجب کا اظہار کیا کہ میں اس کی صورت دیکھ کر اپنی جگہ سخت متعجب اور متفکر ہوا کہ الہیٰ ماجرا کیا ہے۔ اتنے میں ایک پنجابی نے یہ بتایا کہ جس راستے سے میں گزر کر آیا ہوں۔ وہاں سے کبھی کسی شخص کا گزر نہیں ہوا کیونکہ یہ جگہ "لنڈی گھر" کے نام سے مشہور ہے۔ تب مجھے یاد آیا کہ راستے میں ہر قدم پر میرے قدموں میں ناقابل فہم قسم کی جو سرسراہٹ تھی۔ ہو نہ ہو وہ اسی "لنڈی" کی تھی۔ بہرحال ظفر آباد اسٹیٹ پہنچ جانے کے بعد راستے کی صعوبتیں ہوا ہو جاتیں۔ جہاں دُنیا بھر کی نعمتیں میری منتظر ہوتیں۔ چوہدری عزیز احمد تازہ کیلا اور پپیتا باغ سے منگواتے اور ڈھیروں کے حساب سے ہم اسے چٹ جاتے۔ میرا تجربہ ہے کہ درخت پر پکے ہوئے پپیتے سے لذیذ اور شیریں پھل کوئی اور نہیں ہوتا جب کہ یہی پپیتا جب پنجاب میں جا کر فروخت ہوتا ہے تو اس کے کھانے سے کہیں بہتر ہے کہ انسان بخوشی فاقہ کرلے۔

خالو لطیف اور ہماری خالہ کی شادی پر ابھی صرف دس ہی برس گزرے تھے جب کہ ان کا بڑا بیٹا ناصر محمود خاں صرف چھ برس کا اور باقی بچوں کی عمریں بالترتیب چار سال دو سال، چھ ماہ کی تھیں کہ انہیں اپنڈے سائیٹس کا عارضہ ہوا اور وہ میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئے۔ دریں اثنا ان کے منہ اور ناک سے کچھ خون باہر نکلا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ اپنڈکس اچانک پھٹ جانے سے ان کی موت واقع ہوئی ہے یہ ایک بظاہر ناقابل برداشت صدمہ تھا جسے میری جواں سال خالہ نے نہایت ہمت و استقامت سے برداشت کیا۔ میں نے اس سانحہ کے بارے میں چودھری محمد ظفر اللہ خاں کو ایک خط لکھا اور یہ درخواست کی کہ چونکہ مرحوم کے چار کم سن بچے ہیں اس لئے ان کی اور بیوہ کی دستگیری کی جائے جو کہ عین اسلامی فریضہ ہے۔ اس غرض سے میں نے یہ بھی تحریر کیا کہ بہتر ہو گا اگر اسٹیٹ سے ان کے لئے ماہوار گزارہ الاؤنس مقرر کیا جائے۔ مجھے اس خط کو لکھے ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ اسٹیٹ کی جانب سے چودھری عزیز احمد نے میری خالہ کو مطلع کیا کہ چودھری محمد ظفر اللہ خاں نے بچوں کے لئے چالیس روپے ماہانہ گزارہ الاؤنس مقرر کیا ہے۔ چودھری محمد ظفر اللہ خاں کی حیثیت اور اسٹیٹ کی مالی حالت کے پیش نظر یہ رقم نہایت معمولی اور ناقابلِ ذکر ہے۔ لیکن اِن دنوں مہنگائی کی یہ شرح نہ تھی۔ اور اتنی رقم میں ایک آدمی کا گزارہ مشکل نہ تھا۔ تاہم یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اس وظیفے کی بدولت کئی بار اس گھر کا چراغ بجھتے بجھتے جل اُٹھا۔ خالہ گو ہمارے نانا اور ماموں کے پاس رہنے لگیں اور ان کو رہنے کے لئے ہم نے اپنا مکان پیش کیا لیکن بسا اوقات جب کبھی تنگی آتی ہے اور خالہ اپنی طبیعت اور مزاج کے مطابق اپنی بدحالی کا کسی سے تذکرہ نہ کرتیں تو عین اِسی وقت ڈاکیہ آتا اور گزشتہ چھ ماہ کا وظیفہ ان کی خدمت میں پیش کر دیتا۔ اِن واقعات کی رُو سے مجھے یقین کامِل ہے چودھری ظفر اللہ خاں جن کے بارے میں معلوم ہوا ہے کہ انہوں نے لاتعداد مستحقین، یتامیٰ اور بیوگان کے وظیفے مقرر کر رکھے ہیں۔ اپنی صرف اِسی خوبی اور

سعادت کی بنا پر خدا کی درگاہ میں کامیاب و کامران ہوں گے کیونکہ خدا کے بندوں کا خیال رکھنے والا کبھی خدا کی خوشنودی سے تہی دامن نہیں رہ سکتا۔

جن دنوں چودھری محمد ظفر اللہ خاں عالمی عدالت انصاف کے صدر تھے پاکستان میں ان کے حلف صدارت کی تقریب کی ایک فلم دکھائی گئی تھی۔ انہوں نے اپنے عہدے کا حلف لیتے ہوتے جب قرآن حکیم کی آیاتِ مبارکہ "رب اشرح لی صدری ویسر لی امری" کی تلاوت کرتے ہوتے استقامت الٰہی طلب کی چونکہ ہمارا پریس غیر ملکی خبر رساں ایجنسیوں کا محتاج ہے۔ اور ان خبر رساں ایجنسیوں کو ان آیات کی کوئی سمجھ نہ آئی۔ لہٰذا ہمارے پریس میں بھی ان کا تذکرہ نہ ہوا اور اگر ایک آدھ اخبار نے اس کا نوٹس لیا بھی تو وہ مزید مضحکہ خیز تھا بہر حال چودھری صاحب کی یہ عادت ہے کہ وہ ہر کام میں اللہ تعالےٰ سے مدد حاصل کرتے ہیں نیز اپنی مادری زبان پنجابی کو بھی فراموش نہیں کرتے یہاں تک کہ غالباً عالمی عدالت میں ہی ایک فیصلہ تحریر کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ریمارکس میں پنجابی کی ایک ضرب المثل "رب نے دتیاں گاجراں تے وچ ای رنبا رکھ" بھی لکھ دی" یہ ضرب المثل پتہ نہیں ہیگ والوں کے پلے پڑی یا نہیں۔ لیکن اس سے چودھری صاحب کے مزاج اور ان کی حب الوطنی آشکارا ہوتی ہے۔

مُفتی بشارت احمد

پاکستان بار کونسل کے ممبر رہے ہیں اور انٹرنیشنل بار کونسل کے آج بھی ممبر ہیں آج تک ان کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں ہوسکا کہ وہ شاعر بہتر ہیں یا وکیل بہت خوب صورت شعر کہتے ہیں۔ ان کے کلام میں موسیقی اور ندرت کے ساتھ ساتھ جذبات و احساسات کی زوردار ترجمانی کی خصوصیت بھی پائی جاتی ہے بعض ناگفتنی باتوں کو بھی اس سلیقے سے شعر کا جامہ پہنا دیتے ہیں کہ سُننے والا یہ سوچنے پر مجبور ہوجاتا ہے کہ ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

حُسن اور موسیقی دونوں ہی ان کی پسندیدہ ڈشیں ہیں۔ دوران سفر اپنی کار میں گیتا دت، سہگل، لتا اور نورجہاں کے گائے ہوئے چوٹی کے گیتوں کی ٹیپ سب سے پہلے رکھتے ہیں۔ اور گاڑی سٹارٹ کرنے سے پہلے اس کو آن کرتے ہیں۔ جب بھی ملتے ہیں مصافحے کے ساتھ معانقہ کرکے ملاقات کی تکمیل کرتے ہیں۔ نہایت محبّت سے کرسی پیش کرنے کے بعد بھول جاتے ہیں کہ کوئی آیا بیٹھا ہے دریں اثنا، نئے آنے والوں کو زور زور سے بھینچنے اور ان کو سینے سے لگانے کے بعد بیٹھے ہوئے دوستوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ کرتے چلے جاتے ہیں اور پھر اچانک "جی کچھ سناؤ نا" کہہ کر سب کو اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں اتار لیتے ہیں اور پھر چائے کے ساتھ ساتھ طویل ترین پُرمغز گفتگو کا دور اس وقت تک چلتا ہے جب تک سیشن کورٹ سے ان کی طلبی نہیں ہوجاتی۔

مُحمد قیوم اعتصامی

بجلی کے کسی کھمبے کی طرح لمبا تڑنگا اگر کوئی شخص کتابوں اور رسالوں کا بنڈل اٹھائے "نوائے وقت" کی سیڑھیاں اُتر رہا ہو تو سمجھ لیجئے کہ وہ قیوم اعتصامی ہے جو آپ کو دیکھتے ہی حاتم سے بھی لمبا مگر سرد سا ہاتھ مصافحے کے لئے آپ کے ہاتھ میں یوں دے دے گا جیسے کوئی "قابلہ" دیوار میں فِٹ کیا جا رہا ہو۔ ساتھ ہی نہایت شیریں اور مخصُوص سے لہجے میں پُوچھے گا "یار تُسیں تے ہُن آؤنا ای چھڈ دِتا"۔ آپ اپنی مصرُوفیت کا رونا رونے اور اس سے چائے پینے کے بعد اس کے دفتر میں آنے کا وعدہ کر کے اس سے بادِلِ ناخواستہ اجازت لیں گے اور جب چند روز کے بعد اس کا اشتیاق یاد کر کے اور اپنا وعدہ پُورا کرنے کی غرض سے اس کے کمرے میں جائیں گے اور اُسے ایک زبردست سلام کر کے یہ تمنّا رکھیں گے کہ اب وہ آپ کو بیٹھنے کے لئے کہے گا مگر وُہ اخبار کی کسی کاپی پر جھکا ہوا پرُوف چیک کر رہا ہو گا۔ سُرخیاں جما رہا ہو گا، یا کیپشن تجویز کر رہا ہو گا آپ حیران و پریشان کھڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ لوگوں کو سیدھی راہ پر چلانے پر مامور ایک بزرگ صورت شخصیت خشمگیں نگاہوں سے آپ کو دیکھے گی اور یوں آپ کو سیڑھیوں تک جانے کی سیدھی راہ نظر آنے لگے گی اور جب آپ وہاں سے کھسک آنے کا مکمل پروگرام طے کر کے کمرے سے نکلنے ہی والے ہوں گے کہ قیوم اعتصامی کی نگاہیں آپ کا کیچ لے لیں گی اور وہ آپ سے پوچھے گا "تُسیں کد آئے"؟ اس سوال پر آپ کو غُصّے کی جگہ

بے حد ہنسی آئے گی۔ کیونکہ غصہ کرنے کے لئے اور لوگ وہاں بہتیرے ہیں۔

قیوم اعتصامی ایک اچھا اخبار نویس ہی نہیں بے حد اچھا دوست بھی ہے، ملنسار بھی ہے اور خوش اطوار بھی۔ میں نے ایک روز اس سے جب یہ پوچھا کہ جب وہ اتنی محنت سے کام کرتا ہے۔ اس نے کتابیں وغیرہ بھی لکھی ہیں بالخصوص "محمد علی باکسر" پر اس کی کتاب کافی مقبول ہوئی تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس کے بہت بعد میں آنے والے کارکن اس سے اچھا گریڈ لے رہے ہیں تو اس نے ایک طویل آہ سرد اس کے جواب میں یوں بھری کہ میں نے اپنا سوال فوراً واپس لے لیا۔

قیوم اعتصامی کو نادر مضامین لکھنے کا شوق جنون کی حد تک ہے اس کے لکھے ہوئے ان مضامین کو اگر کتابی شکل دی جائے تو یقیناً کئی مجموعے بن جائیں گے۔ سالہا سال سے اس سے میری ملاقات ہے اور اب گزشتہ دنوں میں نے اس کے لبوں سے پہلی بار ایک اقتصادی خوش خبری سنی ہے کہ وہ اپنا ذاتی مکان تعمیر کر رہا ہے۔ تفصیلات کے مطابق اس کے چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی صحافت اور محنت پر ترس کھایا ہے اور یوں قیوم اعتصامی بھی ایک کٹیا تعمیر کرنے میں کامیاب ہو ہی گیا ہے۔

محمود احمد ظفر

محمود ظفر میرا لنگوٹیا ہے۔ جس نے دوستی کے رشتے کو پہلے سے بھی زیادہ مضبوط بنانے کے لئے ہمیشہ سرتوڑ کوشش کی ہے۔ مگر جن دنوں وہ چونگی امرسدھو کے نواح میں ایک کنسٹرکشن کمپنی میں چیف اکاؤنٹنٹ تھا اور میں حسبِ معمول بے کار تھا تو وہ مجھے وہاں لے گیا اور باعزت روزگار پر مجھے لگا دیا۔ میں فرم کے مالکان اور انتظامیہ کی نظروں میں بڑی وقعت رکھتا تھا کہ اچانک ایک حادثے نے میری عزت، شہرت اور وقار کو خطرے میں ڈال دیا۔ جب کہ اس میں میری ذات کا کوئی قصور یا فروگزاشت نہ تھی یہ تو ایک ایسی شُدنی تھی جس کے بارے میں میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ہزاروں روپے کا آگ کی نذر ہو جانا اور وہ بھی کسی MENTAL · PATIENT کے ہاتھوں، کون اس کا تصوّر کر سکتا ہے؛ بہر حال محمُود احمد ظفر میری جگہ قربانی کا بکرا بنا جب کہ میں صورتِ حالات بتائے بغیر ہی پردۂ سکرین سے غائب ہو چکا تھا۔ اس کے دل گردے کا کیا کہنا کئی بار راستے میں مجھے ملا۔ مگر کبھی اس نے اس حادثے کی تفصیلات نہیں پوچھیں

ابھی چند روز قبل میں نے دیکھا کہ وہ ایک نئے سکوٹر پر بیٹھا تھا۔ بڑے تپاک سے ملا۔ میرے دل کو تسلی ہوئی کہ میری وجہ سے وہ جس ابتلاء کا شکار ہوا تھا کم از کم وہ تو اس سے نکلا۔

محمود مرزا جہلمی

محمود احمد مودی نے جو آج کل "نظارہ ڈائجسٹ" کا نظارہ کروا رہے ہیں ۔ میری بے کاری پر ترس کھا کر مجھے "دھنک" کے سپیشل سپلیمنٹ نکالنے اور ان پر کمیشن کمانے کی اجازت لے دی چنانچہ اس غرض سے میں نے سیالکوٹ، گوجرانوالہ، گجرات اور جہلم کا دورہ تقریباً دو ماہ میں مکمل کیا ۔ بارشوں کے دن تھے سیالکوٹ میں نالہ ایک کا سیلاب زوروں پر تھا جس سے کاروبار بھی متاثر تھے تاہم دو چار اشتہار مجھے مل ہی گئے سیالکوٹ سے میرا جسمانی اور قلبی تعلق ہے میرا خیال تھا کہ وہاں مجھے کافی کامیابی ہو گی لیکن وہاں پہنچ کر یہ اندازہ ہوا کہ سیالکوٹ کی آب و ہوا خاصی تبدیل ہو چکی ہے ۔ ہمدرد اور شناسا چہرے مفقود ہیں کاروباری حضرات، اخبارات اور جرائد کے نمائندگان کے "حسنِ سلوک" کی وجہ سے کافی دِل برداشتہ نظر آئے ان کے یہ گلے شکوے کسی حد تک جائز بھی تھے ۔ خود مجھے ایک ایسے ہی "نمائندہ خصوصی" سے پالا پڑ چکا تھا ۔ جو ایک بڑے اخبار کا نام استعمال کرتا ہے اور دوستوں تک کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کرتا ہے ۔ جموں کے راستے بھارت کے چند اخبارات منگواتا ہے اور اپنے مکتوب میں رنگ بھر کے چھپوا لیتا ہے کھیلوں کے صفحے بالخصوص کرکٹ کے سلسلے میں وہ اپنے آپ کو عظیم مبصر خیال کرتا ہے اور یوں حق بجانب ہے کہ کرکٹ اور گرگٹ میں کوئی زیادہ فرق نہیں ۔ کرکٹ بھی گرگٹ کی مانند ناقابلِ اعتماد اور چانس کا کھیل ہے ۔ مذکورہ "نمائندہ خصوصی" بھی

انہی صفات کا حامل تھا ۔ جن دنوں اسے مجھ سے کام تھا اور "اشتہارات" کا شعبہ

حسابات، میرے کنٹرول میں تھا۔ اس کی سرخ و سپید رنگت میں ملائمت اور محبت کی مصنوعی چمک قابلِ دیدنی مگر جب میں اس اخبار سے الگ ہونے کے بعد ایک کتاب چھاپنے کے سلسلے میں سیالکوٹ میں اس کے گھر گیا اور جب وہ نہ ملا تو اپنی آمد کا مدعا لکھ کر اس کے لیٹر بکس میں ڈال دیا۔ میرا وہ عریضہ اس نے محض نمبر بنانے کے لئے اخبار کے مالک کو بھجوا دیا جب کہ ایسا کرنے میں اسے کوئی فائدہ نہ تھا قصہ مختصر یہ کہ سیالکوٹ میں بہت بڑی تبدیلی نظر آئی۔ لوگ پہلے سے کہیں بڑے سیٹھ اور کاروباری بن گئے تھے اور ان کی نگاہوں میں اب وہ شفقت اور ہمدردی کا جذبہ ناپید ہو چکا تھا۔ گوجرانوالہ میں بھی کچھ اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونے کے بعد گجرات چلا گیا۔

گجرات میں محمود مرزا جہلمی کے پاس میں دو چار دن پہلے بھی ایک دفعہ قیام کر چکا تھا مجھے امید تھی کہ اس کے توسط سے گجرات میں ضرور کچھ کامیابی ہوگی۔ محمود مرزا کچہری روڈ کے مکان سے ایک ایسے مکان میں منتقل ہو چکے تھے جہاں ان کا سامنا ہمہ وقت ایک ایسے شخص سے تھا جسے ابنائے آدم اچھے نہیں لگتے ہیں اس کے محل نما۔ مگر ویران — تین منزلہ نئے مکان میں پہنچا تو وہ حسبِ معمول خندہ پیشانی سے ملا اور کہنے لگا۔ جہاں تک سپلیمنٹ کا تعلق ہے اور اشتہار لینے ہیں۔ یہ کام خود کرو۔ البتہ میرا لنگر کھُلا ہے۔ کھاؤ، پیو، عیش کرو۔ میں نے دل میں شکریہ ادا کرنے پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ زبانی بھی اس کا اظہار کیا کہ چلو یہ بھی غنیمت ہے۔ رات کو مرزا صاحب غائب تھے۔ البتہ ان کا لنگر حاضر تھا چنے کی دال اور تنوری روٹیوں نے بڑا مزا دیا۔ اگلے روز غلام مصطفٰے نے پھر چنے کی دال کھلائی اور جب اگلے روز بھی وہ چنے کی دال بھگو رہا تھا تو میں نے اسے کہا کہ مصطفٰے! اس سال سارا چنا محمود مرزا نے ہی خرید کر لیا ہے؟ ظاہر ہے کہ گھوڑے اور انسان میں کافی فرق ہے۔ لہٰذا لنگر سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ یہ لنگر بھی ایک دو روز

مزید چلنے کے بعد لنگر لنگوٹا کس کر چلتا بنا۔ کیونکہ مرزا صاحب کا دور دور تک کوئی پتہ نہ تھا۔ کئی روز کے بعد جا کے معلوم ہوا کہ محمود مرزا کو لوگ بار بار پوچھتے تھے کہ جب تم جہلمی ہو تو گجرات میں کیا کرتے ہو۔ اس روز روز کے سوال کا ایک ہی جواب تھا کہ وہ مستقل طور پر جہلم منتقل ہو گئے۔ ان کی کمی سب دوستوں نے بے حد محسوس کی۔ چار پانچ دوست بیٹھے ہوں۔ درمیان میں محمود مرزا ہو کیا مجال جو وہ کسی دوسرے کو بولنے کا موقع دے۔ بے تکان بولتا چلا جائے گا۔ قہقہے پہ قہقہے لگائے گا اپنی ذات برادری مغل ہونے کا تذکرہ کرے گا اور مخاطب کے دماغ کی "ائی تئی" پھیر کر رکھ دے گا۔ مجلسی آدمی ہے۔ دوست بھی بہت اچھا ہے۔ دوستی نبھانا بھی جانتا ہے اور دشمنی بھی یہ الگ بات ہے کہ گجرات سے جہلم چلا جانا ہے۔ جب سے جہلم گیا ہے میں اس کے ڈیرے پر نہیں گیا کہ اس کے لنگر سے بڑا خوف آتا ہے۔ اس کو یہ کریڈٹ بھی جاتا ہے کہ گجرات میں میرا کوئی ہمدرد شناسا اور دوست نہیں تھا۔ جب میں اس کے ہاں گیا لیکن آج وہاں ہر دوسرا شہری مجھے نہ صرف جانتا ہے بلکہ اکثر صاحبِ کردار حضرات میرے ہم نوالہ و ہم پیالہ ہیں ⁂

مرزا عبدالحمید

لانبا قد، کھلتا ہوا رنگ، کھلی پیشانی اور لبوں پر تبسم جو بڑھ چڑھ کر قہقہہ بن جاتا ہے۔ یہ ہیں مرزا عبدالحمید جو پریس میں بیٹھے یوں لگتے ہیں جیسے کوئی سوٹڈ بوٹڈ باتیں کرنے کی آفسٹ مشین لگی ہو۔ مرزا صاحب لطیفے گھڑتے نہیں بلکہ لطیفے خود بخود ان سے صادر ہوتے ہیں۔ لاہور سے کراچی تک ایک سفر میں مرزا صاحب اور حکیم محمد طارق میں لطائف و ظرائف کا جو مقابلہ ہوا وہ حاضرین کو مدتوں یاد رہے گا اس میں مرزا صاحب کا بیان فرمودہ واقعہ "سُن تاں" جو ٹھیٹھ جالندھری لہجے میں سنایا گیا تھا۔ آج بھی یاد آتا ہے تو چارپائی بُننے والوں کی ہیئت کذائی نظروں کے سامنے آجاتی ہے اور بے اختیار قہقہے اُبلنے لگتے ہیں ؂

شیخ مراد علی قلعہ گوجر سنگھ میں جنرل سٹور چلاتا تھا بعد ازاں ایک نیم سرکاری محکمے میں ملازم ہو گیا پھر مجھے پتہ چلا کہ وہ بیرون ملک چلا گیا ہے بہت دبلا پتلا نحیف و نزار ہونے کے باوجود ارادے اور ہٹ کا پکا۔ شیخ مراد علی بلاشبہ ایک مخلص دوست اور محب وطن نوجوان ہے محنت مشقت اور دیانت پر عمل کرتا ہے اور بڑی "ٹُھک" زندگی گزارنے کا عادی ہے۔

مرزا محمود احمد

واہگہ کی سرحد پر ٹرکوں نے کچھ دیر قیام کیا۔ جہاں تاحدِ نگاہ ہزاروں بے سروساماں پناہ گزیں آ رہے تھے۔ واہگہ سے لاہور جانے والی سڑک اور اس کے نواحی علاقوں میں یہ قافلے دُور دُور تک پھیلے ہوتے تھے۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا خوش نصیب ہوگا جسے کسی نہ کسی عزیز اور قریبی رشتے دار کی جدائی کا صدمہ برداشت نہیں کرنا پڑا تھا لیکن اب پاکستان پہنچ جانے کی خوشی میں وُہ دیوانہ ہوتے جا رہے تھے دن کے دو بجے کے لگ بھگ ہمارا قافلہ لاہور میں میو ہسپتال کے قریب واقع جودھامل بلڈنگ کے سامنے آن رُکا۔ درود شریف بلند آواز سے پڑھتے ہوتے لوگ نیچے اُترے میں بھی اپنے رفیق سفر اور محافظ سپاہی سے آخری بار مصافحہ کر کے پندرہ فٹ کی بلندی سے نیچے کود گیا۔

اَب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ میں جاؤں کہاں۔ نیا شہر، نئی جگہ، نہ جان نہ پہچان، اسی سراسیمگی کے عالم میں ایک عزیز نظر آتے۔ جن کا لاہور میں ہی قیام تھا۔ انھوں نے آنکھ بچانے کی کوشش کی جسے میں نے ناکام بنا دیا اور ان کو جا پکڑا انھوں نے رسمی طور پر حال احوال پُوچھا اور چلنے لگے میں نے کہا بھائی صاحب مجھے بھی ہمراہ لے چلیے میرا تو کوئی ٹھکانہ نہیں۔ انھوں نے کچھ سوچ کر مجھے اپنی سائیکل پر بٹھا لیا اور اپنے گھر لے گئے وہاں پہنچ کر اپنی والدہ سے جو میری خالہ بھی ہوتی ہیں اور پھوپھی بھی۔ والد اور والدہ کے بالترتیب حقیقی ماموں اور حقیقی تایا کی صاحبزادی ہیں۔ میرے بارے میں بتایا کہ یہ اکیلا ہی آ گیا ہے انھوں نے

میری بلائیں لیں اور اپنے صاحبزادے سے کہا کہ جگہ بہت کم ہے۔ بے شمار عزیز آ گئے ہیں اسے (یعنی مجھے) جودھامل بلڈنگ چھوڑ آؤ۔ چنانچہ پانی کا ایک گلاس پئے بغیر ہی میں پھر ان کی سائیکل پر سوار تھا۔ وہ مجھے دوبارہ جودھامل بلڈنگ لے آئے۔ جس کے سامنے رتن باغ واقع تھا (اب یہ جگہ میو ہسپتال میں شامل ہے)، رتن باغ میں جدھر نگاہ اٹھتی تھی۔ سراسیمہ چہرے آ رہے تھے۔ بے یارو مددگار۔۔ پناہ گزینوں کے سیلاب کی وجہ سے افراتفری کا عالم تھا چنانچہ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔ مرزا محمود احمد برآمدے میں ٹہل رہے تھے ان کے ہاتھ میں جیبی حمائل شریف تھی۔ اور وہ انتہائی خوش الحانی کے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے میں ٹھٹھک کر رہ گیا اتنے میں انہوں نے دل سے جگر تک اُتر جانے والی نظر سے مجھے دیکھا اور پوچھا "کیا بات ہے" میں نے عرض کی کہ میں اکیلا گھر سے پاکستان آیا ہوں، رہنے کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ انہوں نے فرمایا۔ فکر کی کوئی بات نہیں چنانچہ اپنے سب سے چھوٹے بیٹے مرزا رفیق احمد (جو میرا ہم عمر ہے)، کو بلایا اور مجھے اپنے ساتھ ٹھہرانے کا حکم دیا۔ کچھ دیر کے بعد کھانے کا وقت آ گیا چنانچہ دو دو توس تھوڑا سا مکھن اور چائے کا ایک ایک کپ مجھے اور مرزا رفیق احمد کو "ظہرانہ" دیا گیا۔ وہ توس آج بھی جب مجھے یاد آ جاتے ہیں تو سرور دے جاتے ہیں۔ سخت بھوک کے عالم میں تو مکئی کا ایک دانہ بھی نعمتِ عُظمیٰ سے کم نہیں ہوتا۔

مرزا محمود احمد کی تخلیق میں قدرت نے ہر طرح کی فیاضی سے کام لیا تھا وہ بیک وقت بہترین مقرر، شاعر، ادیب، منتظم، زرعی ماہر، طبیب، رہنما، سیاستدان مورخ، مفسر، شوہر، باپ اور دوست تھے، ان کا حافظہ بلا کا تھا۔ قرأت نہایت خوش الحانی سے کرتے تھے، تقریر و تحریر میں فصاحت و بلاغت کے دریا بہاتے تھے۔ رنگت سفید اور سُرخ پائی تھی۔ سر پر بے حد سفید پگڑی باندھتے، شیروانی اور

شلوار پہنتے اور ہاتھ میں چھڑی رکھتے، مرزا غلام احمد قادیانی نے جو جماعت بنائی تھی اس میں بے پناہ اضافہ کرنے اور اس کو قابلِ تعریف حد تک منظم کرنے کا کریڈٹ مرزا محمود احمد کو ہی جاتا ہے گو اس کریڈٹ میں وہ مولگند بھی حصہ دار بن سکتے ہیں جو قادیان والوں کے بارے میں ایسی حکایتیں اور افسانے گھڑتے تھے جن کا کوئی وجود اور جن کی کوئی حقیقت نہیں تھی۔ مثلاً یہ کہ قادیان میں حوریں ملتی ہیں۔ وہاں ہر شخص کی شادی ہو جاتی ہے۔ وہاں بہشت اور دوزخ واقع ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ مرزا محمود احمد کی ذات ایک انجمن تھی۔

البتہ ان کا ایک فیصلہ جس نے جماعت کے غریب اور متوسط طبقے کو اقتصادی و معاشی پریشانیوں کا شکار بنا دیا وہ یہ تھا کہ انہوں نے اپنی جماعت کے افراد کو قادیان کی متروکہ جائیداد کا کلیم پاکستان میں داخل کرنے سے منع کر دیا ان کے اس فیصلے پر عمل صرف انہی لوگوں نے کیا جو غریب اور درمیانہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے اور جو طبقہ پہلے ہی مراعات یافتہ تھا انہوں نے حسبِ عادت اس سے رُوگردانی کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بے شمار ایسے پناہ گزین جو اپنی جائیدادیں چھوڑ کر آئے تھے خستہ و خراب و خانماں برباد رہ گئے اور آج طویل مُدّت گزر جانے کے بعد بھی سر چھپانے کے لئے ان میں سے اکثر کے پاس کوئی جگہ نہیں اس کے برعکس وہ لوگ لاکھوں میں کھیل رہے ہیں جنہوں نے پاکستان میں کلیم داخل کئے اور یوں نئے وطن میں اپنی اقتصادی و معاشی حالت کو سدھارنے کے لئے روزِ اول سے ہی کارروائی کا آغاز کر دیا۔

مرزا محمود احمد جب تک بقیدِ حیات رہے۔ مستحقین کی بلالحاظ مذہب و ملت غیر مشروط مالی امداد کرتے رہے اور یوں غرباء کے مسائل کے حل کی کوئی کا کوئی راہ نکلتی رہی مگر ان کی وفات کے بعد اس اہم مسئلے پر توجہ نہ دی گئی اور جماعت کی بڑھتی ہوئی نفری اور نوجوان نسل کو فنی تعلیمات سے آراستہ کرنے اور بے روزگاری کی بھینٹ چڑھنے والوں کے لئے کوئی راہِ عمل اور راہِ نجات تجویز نہ کی گئی جب کہ جماعت کی تحویل میں خاصے فنڈز اور محض ایک اشارے پر کروڑوں روپے چندہ دینے والے افراد کی کوئی کمی نہ تھی۔

مسعود الرحمٰن

ایک عرصے تک اس لئے مالی مشکلات کا شکار رہا کہ الحدید بند تھا۔ اب اس لئے پریشان حالی سے دوچار ہے کہ الحدید باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ جب الحدید بند تھا تو مجیب الرحمٰن شامی کی جانب سے کئی ماہ تک اسے باقاعدہ ایک چھوٹی سی رقم، جو اس کے لئے پوری طرح کافی نہیں تھی۔ مگر غیر اہم بھی نہیں تھی۔ ملتی رہی بعد ازاں جب ایک روز وہ وظیفہ بند ہو گیا تو بے چارہ مسعود الرحمٰن جو پہلے ہی سنگل پسلی اور سنگل آنکھ کا مالک تھا۔ مزید نصف ہونے کی تیاریوں میں مصروف ہو گیا خاصہ بے ضرر ہونے کے باوجود دوستوں کی اکثریت اس سے کنی کتراتی ہے بہت سمجھایا ہے کہ جس بات کو تم حق جانتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا اظہار نامناسب ہو۔ مگر اس کے معمولات میں کوئی فرق نہیں آتا یہاں تک کہ صبح کا ناشتہ پرستش ہوٹل سے کرتا ہے۔ جس سے لوگوں کے اس وہم کو تقویت ملتی ہے کہ اس کے حالات دگرگوں نہیں ہیں۔

مسعود جاوید ہمدانی

سینیئر اور بزرگ صحافی بشیر احمد ارشد کے کمرے میں جو بزرگ نوجوان صحافی ابن صحافی ان کے دائیں ہاتھ بیٹھتا ہے۔ وہی مسعود جاوید ہمدانی ہے۔ وہ اگر سینیئر سب ایڈیٹر نہ ہوتا تو یقیناً کسی خانقاہ میں ہوتا اور تصوف و فلسفہ کا سینیئر سب امام ہوتا۔ بے حد متوکل، راضی بر رضا رہنے والا ہمدانی بے حد مخلص اور شفیق دوست ہے۔ جب بھی ملتا ہے، درویش مست اور مرد قلندر کے روپ میں ملتا ہے۔ بڑی محبت اور اپنائیت سے مجھے مشورہ دیتا ہے کہ میں اپنے "عقیدے" پر نظر ثانی کروں۔ میں ہمیشہ اس سے کہتا ہوں کہ کسی کے محض قول اور زبان سے کوئی دعویٰ کر لینے پر میں اعتقاد نہیں رکھتا۔ میرے دل میں محض اس شخص، گروہ یا سوسائٹی کی قدر ہے جو "حقوق العباد" ادا کرتی ہے۔ کیونکہ حقوق اللہ میں اکثریت کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ اگر بندوں کے حقوق ادا کر دیئے جائیں تو اللہ کے حقوق از خود ادا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ماں باپ کی خدمت، ہمسایوں کا خیال، دوستوں کی امداد، بھائیوں سے حسن سلوک، معاشرے کو خوش حال بنانے کے لئے، بیتیموں، بیسیروں، بیماروں مسافروں، ضرورت مندوں، بے کسوں، بھوکوں، ننگوں اور بے سہاروں پر اپنے اس رزق سے جو خدا نے دیا ہے خرچ کرنا اور احسان نہ جتانا یہ سب ایسے حقوق العباد ہیں۔ جو سب کے سب حقوق اللہ میں شامل ہیں۔

میں ڈھٹائی سے کہتا ہوں کہ میرے نزدیک گنگا رام، دیال سنگھ، گلاب دیوی، جمعیت سنگھ اور اس قبیل کے وہ تمام افراد جنہوں نے رفاہِ عامہ کے کام کئے ہیں اُس چنن دین اور گل خاں سے کہیں بہتر ہیں جن کا عقیدہ کچھ تھا اور عمل کچھ اور۔ میری یہ سب باتیں سن کر وہ اپنے دُبلے اور لانبے سے ہاتھ کو جھٹک کر اسے دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے پھر سے "سلوک" اور تصوف پر پُر اثر لیکچر دینے لگتا ہے اور اُسے مزید مدلل بنانے کے لئے اپنی سچی واردات بھی عاجزی اور انکساری کے ساتھ اس لیکچر میں شامل کرتا چلا جاتا ہے۔ جب وہ جذب کے سمندر میں ڈوب رہا ہوتا ہے تو میں اکثر سوچا کرتا ہوں کہ اگر مسعود جاوید چہرے پر ڈاڑھی رکھ لے۔ شلوار قمیض اور شیروانی پہنے، ہاتھ میں چھڑی رکھے اور سر پر عمامہ باندھے تو کیسا لگے؟

میٹھا آدمی

بیڈن روڈ سے مال کے کونے سے لکشمی مینشن کو جو راستہ جاتا ہے وہاں بدر کا ٹی سٹال ہے صبح سے شام تک یہ شخص مشین کی طرح سیٹ پر سیٹ چائے بنا کر اپنے گاہکوں کو بھجواتا ہے۔ خوراک کے دفتروں میں چکر لگاتا ہے مگر اس کے چہرے سے کبھی تکان، اکتاہٹ یا افسردگی کا اظہار نہیں ہوتا۔ بے حد خلیق، ملنسار، محنتی اور غریب پرور انسان ہے دن میں بیس پچیس کپ چائے اپنے ان پرانے گاہکوں کو زبردستی مفت پلوا کر بہت خوش ہوتا ہے۔ جو آج کل اس کے جگری دوست ہیں۔

ایبٹ آباد کا رہنے والا ذہین اور مشینی انداز سے کام کرنے والا بدر اپنی چائے کی مانند بے حد میٹھا آدمی ہے۔

مصطفیٰ صادق

میرے خانگی اور مالی حالات بے حد دگرگوں تھے کہ ایک روز محبیّ و مشفقی جمیل اطہر نے مجھے یاد کیا اور مجھے اپنے ذاتی روزنامہ "تجارت" کا نمائندہ خصوصی تجویز کیا تین چار ماہ تک ان کے ساتھ کام کرتا دریں اثنا میری وجہ سے شاید "تجارت" کو اتنا مالی فائدہ نہ ہوا جتنا کہ اللہ تعالےٰ نے میرے لئے کشائش کے سامان کر دیئے جمیل اطہر اس دوران میں لاہور کے علاوہ گوجرانوالہ سے بھی اپنے اخبار کی روزانہ اشاعت کا آغاز کر چکے تھے اور اب انہیں میری چنداں ضرورت نہ رہی تھی۔ انہوں نے ازراہِ اخلاق میرے بارے میں وفاق کے مالک اور چیف ایڈیٹر میاں مصطفیٰ صادق سے بات کی یا شاید پہلے میرا عندیہ لیا اور پھر ان سے بات کی بہرحال دوسرے تیسرے روز انہوں نے مجھے نوید سنائی کہ میرا وفاق میں کام بن گیا ہے اور یہ کہ میں میاں صاحب سے مل لوں۔ چنانچہ میں میاں مصطفیٰ صادق کے روبرو حاضر ہو گیا۔ انہوں نے میرے گھریلو حالات سنے۔ بہت ہمدردی کا اظہار کیا اور کہنے لگے کہ میرے مرحوم بھائی کے گھریلو حالات بھی بالکل آپ جیسے تھے وہ تو اپنی اہلیہ کی طویل پُراسرار بیماری کے غم کی تاب نہ لا سکے اور اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔ ہماری بھابی بیچاری ابھی تک دماغی طور پر اسی طرح بے کار اور عاجز ہیں جیسے کہ آپ نے اپنی اہلیہ کے بارے میں بتایا ہے۔ اس اظہار ہمدردی کے بعد فرمانے لگے کہ تین چار کی کاپی کے آپ نگران ہوں گے تنخواہ اور کام کے بارے میں جمیل اطہر صاحب سے بات کر لیں کیونکہ میرے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا۔ البتہ یہ امر آپ کے ذہن نشین رہنا چاہیئے کہ یہاں جو شخص ایک بار ملازم ہو

جاتا ہے اسے فارغ کرنا ہماری روایت میں شامل نہیں ہے۔ چنانچہ میں مطمئن ہو کر وہاں سے اٹھ کر جمیل اطہر کے کمرے میں آگیا اور انہیں اپنے مذاکرات سے آگاہ کیا وہ کچھ دیر کے بعد مصطفےٰ صادق سے ملنے چلے گئے۔ واپس آئے اور چند فائلیں میری تحویل میں دیتے ہوئے "بزن" کا سگنل دیا۔ چنانچہ میں نے انتہائی محنت سے کام شروع کر دیا۔ میں نے اخبار کی سابقہ فائلوں کو بغور دیکھا تو پتہ چلا کہ ۲/۳ کی کاپی پر اکثر پرانے مضامین بار بار شائع کئے جاتے تھے اور بعض مضامین دوسرے اخبارات سے کاٹ کر چھاپ دیئے جاتے تھے میں نے اس روایت کو ختم کرنے اور اخبار میں نئی زندگی ڈالنے کے لئے روزانہ تین چار مضامین لکھنے شروع کر دیئے چنانچہ اخبار کے مضامین کی تازگی اور ندرت کو کئی دوستوں نے محسوس کیا ابھی چوتھا یا پانچواں روز تھا کہ جمیل اطہر نے مجھے مصطفےٰ صادق کا ایک پروانہ دکھایا جس پر تحریر تھا۔ "نعیم کو گزشتہ جمعرات تک کا معاوضہ دے کر فارغ کر دیا جائے"۔ یہ اتوار کا دن تھا۔ جمعہ کے روز دفتر میں سوائے میرے ابھی کوئی اور کارکن نہیں تھا کہ میاں صاحب کا گھر سے فون آیا اور انہوں نے اس روز دو بار مجھ سے بات کی۔ ہفتے کے روز میں ایک عدالتی پیشی کے سلسلے میں جمیل اطہر کے نوٹس میں لانے کے بعد گجرات گیا تھا کہ واپسی پر اتوار کے روز یہ پروانہ مجھے دکھایا گیا۔ میں نے جمیل اطہر سے پوچھا کہ بات کیا ہوئی؟ کہنے لگے۔ آپ ان سے خود مل لیں چنانچہ میں بادلِ ناخواستہ ان کے کمرے میں چلا گیا۔ فرمانے لگے ۲/۳ صفحہ بے حد اہم ہوتا ہے۔ وہاں تو آپ کے مضمون شائع ہوتے ہیں اور میرا ذاتی مضمون صفحہ دو پر شائع ہوا ہے، یہ غلطی اور قصور کوئی کم نہیں۔ میں نے عرض کیا۔ جناب صفحہ دو کے مضامین کا مجھے کوئی علم نہیں آپ اگر یہ مضمون مجھے بھجواتے تو وہ یقیناً صفحہ ۳ پر شائع ہوتا آپ نے صفحہ ۲ کے انچارج کو بھجوا دیا۔ اس میں میرا کیا قصور۔ کہنے لگے

اچھا بات تو بے حد وزنی ہے مگر چونکہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔ پھر کبھی آجائیں۔ اس مسئلے پر دوبارہ غور کریں گے۔ فی الحال اپنے پیسے لے لیں اور ہاں یاد رکھنا۔ گھبرانا بالکل نہیں۔

میں باہر آیا جمیل صاحب کو بتایا کہ جمعہ کے دن میں نے پورا کام کیا ہے چنانچہ انہوں نے جمعہ کا دن بھی شامل کر دیا یا کروا دیا۔ اتنے میں میاں صاحب کے صاحبزادے جو شعبہ حسابات میں انچارج ہیں کہنے لگے آپ کے ذمے ایک اشتہار ہے (ترتیب وار پانچ سطر) میں نے کہا جی ہاں آپ اپنے نمائندوں سے اس اشتہار کے پچیس روپے لیتے ہیں وہ وضع کر لیں۔ کہنے لگے چالیس روپے وضع ہوں گے۔ چنانچہ چالیس روپے انہوں نے وضع کئے اور باقی پیسے جیب میں ڈال کر میں وفاق کی اس بلڈنگ سے باہر آگیا۔ جہاں کبھی نوائے وقت کا دفتر ہوا کرتا تھا۔ اور جہاں اب وفاق کا دفتر ہے۔ جس کی روایت یہ بتائی گئی تھی کہ کسی کو ایک بار رکھنے کے بعد فارغ نہیں کیا جاتا۔

◆ گلزار وفا چودھری کے ایک غائبانہ پرستار کو اس کے روز روز کے تقاضوں سے مجبور ہو کر جب میں نے اصل گلزار وفا دکھایا جب وہ جمیل اطہر سے مل کر آ رہا تھا تو اس پرستار کو غش سا آگیا اور وہ روہانسی ہو کر کہنے لگا "نہیں نہیں وفا کا گلزار ایسا نہیں ہو سکتا"

مقبول احمد

سینیئر اور بزرگ صحافی ہیں ضعفِ جسمانی کے باوجود پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لئے ابھی تک کام کئے جا رہے ہیں اور ایک آدھ اخبار میں باقاعدگی کے ساتھ اُن کا کالم بھی شائع ہوتا ہے جس میں حالات حاضرہ پر کافی تحقیقی مواد ملتا ہے، پیرانہ سالی اور تکلیف دہ حالات کا مقابلہ انہوں نے یوں کیا ہے جیسے "جنگ جو" نوجوان کیا کرتے ہیں۔ مال روڈ پر جو دُبلا پتلا لمبا تڑنگا شخص لٹھے کی شلوار قمیض اور کوٹ پہنے بہت ہی آہستہ آہستہ نپے تلے قدموں سے کسی اخبار کے دفتر کی جانب جا رہا ہو یا وہاں سے واپس آ رہا ہو وہی مقبول احمد ہیں۔ جب بھی ملیں گے نہایت خندہ پیشانی اور شفقت سے بریز ملیں گے۔ اقتصادی معاشی پریشانیوں کے بارے میں سوال کیا جائے تو فرمائیں گے " شکر ہے گزارہ ہو ہی رہا ہے" دو چار سال قبل دُور سے دیکھتے ہی آواز دیا کرتے تھے۔ ہاتھ پکڑ کر زبردستی ہمراہ لے جا کر چائے پلواتے تھے اور بل خود ادا کرتے تھے۔ مگر اب دور سے پہچاننا ان کے لئے مشکل ہے۔ قریب جا کر سلام کیا جاتے تو ہاتھ میں چوٹ لگنے سے یا شاید صحت کی خرابی کی وجہ سے جو ضعف آ گیا ہے وہ مخاطب کا ہاتھ بھی مضبوطی سے نہیں تھام سکتے۔ اور اب وُہ چائے پلوانے پر اصرار بھی نہیں کرتے جب کہ دوسروں سے پینے کی ان میں شروع سے عادت ہی نہیں یہ تمام تبدیلیاں ان میں اِن کی عمر نہیں بلکہ وہ معاشرہ لایا ہے جس نے

زندگی بھر ان سے خوب کام لیا اور اب جب کہ وہ ارذل العمر میں داخل ہو چکے ہیں تو انہیں بقیہ ایام بسر کرنے کے لئے بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔

مقبول صاحب کا ایک قابلِ ذکر وصف یہ ہے کہ وہ اپنے سے چھوٹوں بلکہ بہت ہی چھوٹوں کو بھی نہایت ادب سے پکارتے ہیں اور اپنی کئی سالہ رفاقت کے دوران کبھی بھی میں نے انہیں کسی سے تُو تکار کرتے نہیں دیکھا۔ البتہ ریڈیو سے خبریں لینے کی ذمہ داری بھی ان کے فرائض میں شامل ہوا کرتی تھی۔ ان دنوں "نوائے وقت" نے جو ریڈیو انہیں اس غرض سے دے رکھا تھا وہ اکثر و بیشتر بند ہو جاتا تھا۔ مقبول صاحب کو اس ریڈیو پر ناراض ہوتے ضرور دیکھا ہے جو ان کے تابڑ توڑ مُکّے کھا کھا کر خبریں اُگلا کرتا تھا۔

دوسری بات کہ وہ بس وغیرہ میں سفر کرتے بھی مجھے کبھی نظر نہیں آئے جب بھی دیکھا انہیں "روڈ ٹو آفس" پر پیدل مارچ کرتے ہی دیکھا ۔

مقبول خاں

ذات کا پٹھان ہے مگر معروف "ملک" کے نام سے ہے کہ یہ لفظ بادشاہ اور فرشتہ کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ فرشتوں کو یہ کوتاہ نگاہ کہاں دیکھ سکتی ہے البتہ آدم کے جن بیٹوں کو فرشتہ کہا جا سکتا ہے ان میں سے بھی بعض کو تخت و تاج سے محروم بادشاہوں کی طرح "فٹ پاتھ" پر دیکھا گیا ہے "تاریخ فرشتہ" پڑھی تھی مگر اب یہ یاد نہیں کہ اس میں بھی کسی ایسے فرشتہ کا تذکرہ ہے یا نہیں۔

خیر بات ہو رہی تھی۔ خان مقبول خاں مقبول المعروف ملک کی جو انارکلی سے اپنی قیمتی دوکان اونے پونے بیچ کر اس لئے بھاگا کہ اسے انارکلی کا انجام معلوم ہو گیا تھا، مگر "فٹ پاتھ" اس کے شاید پاؤں کی لکیروں میں تھا کہ ہاتھ کی لکیریں اس کی بڑی بڑی صاف شفاف مخمور آنکھوں کی طرح بہت واضح ہیں۔ وہ پرانی کتابوں کا کاروبار کرتا ہے۔ مگر خود بھی ایک کتاب ہے جو مخملی جلد میں بند پڑی تھی۔

بظاہر وہ گھڑی میں تولہ، گھڑی میں ماشہ دکھائی دیتا ہے۔ ۲۵ پیسے کی کتاب مانگو تو نہیں دے گا مگر پانچ دس روپے کی چائے اور بالوشاہیاں بخوشی کھلا دے گا اور جب موج میں آئے گا تو امیر خسرو کا نایاب دیوان بھی حوالے کر دے گا۔ اس کے اندر جو فلسفی مقبول خاں بیٹھا ہے وہ اس سے نظمیں بھی لکھواتا ہے مگر اس زمانے کا برا ہو، تجریدی آرٹ جو بہت کم کسی کے پلے پڑتا ہے۔ اس کی تو تعریف کرتا ہے لیکن فٹ پاتھ پر بیٹھنے والا

مقبول خاں اگر یہ کہہ دے کہ :-

وقت کی رفتار سے نکل کر
کھڑا ہوں
جہاں تیرے سوا کچھ نہیں
رہن پڑیں آنکھیں جیسے جھیل کنول
میرا انتظار نشانِ راہ کی طرح

تو یہی زمانہ اس سے سندمانگتا ہے۔ اخبارات کے ادبی ایڈیشنوں کے مجاور اس کے دل کی آوازوں اور عظیم کاوشوں کو صرف اس لئے اہمیت دینے کو تیار نہیں ہوتے کہ وہ ردیف و قافیہ کے چکر سے آزاد کیوں ہے۔ بھلے مانسو، کچھ لوگ ایسے بھی تو ہوتے ہیں جو گردشِ شام و سحر سے بھی کلیتاً بے نیاز ہوتے ہیں۔ مقبول خان بھی اسی طبقے سے تعلق رکھتا ہے جو نظر تو شاذ ہی آتا ہے مگر اپنے دَور کا قیمتی سرمایہ ہوتا ہے:

اس کے فٹ پاتھ پر بھی اکثر قیمتی اور نایاب کتابیں ملتی ہیں مگر اس نے اُپنے گھر میں جو لائبریری بنا رکھی ہے وہ کسی بھی بڑی لائبریری سے کم اہمیّت کی حامل نہیں تصوف سے اسے ذاتی دلچسپی ہے۔ لہٰذا اس مضمون پر تو قیمتی کتابوں کا نایاب ذخیرہ اس کے پاس ہے لیکن اس کے علاوہ دیگر نایاب کتُب جن میں مشاہیرِ ادب کے قلمی نسُخے بھی شامل ہیں بہت بڑی تعداد میں وہاں موجُود ہیں۔ مقبول خان جب اپنی ذاتی لائبریری میں بیٹھ کر ورق گردانی کرتا ہے تو خوُد بھی دیکھنے کی چیز ہوتا ہے

ملک ربّ نواز

شیخ غلام علی اینڈ سنز تاجران کتب کا شہرہ نصف صدی سے ہے آجکل شیخ نیاز احمد اس ادارے کے روح رواں ہیں۔ مگر جو شخص سرکلر روڈ سے ہی شیشوں کے اندر سے نظر آتا ہے وہ ملک ربّ نواز ہے۔ ادارے کے مالکان شیخ ہیں مگر ان کا یہ جنرل مینجر ملک ہونے کے باوجود ان کے جسم وجان کا جزو لاینفک ہے اِن کی یہ طویل رفاقت ظاہر کرتی ہے کہ جہاں ملک ربّ نواز اپنی کارکردگی اور صلاحیتوں کی بناء پر قبول عام یا قبول مالکان کی سند رکھتا ہے وہاں شیخ صاحبان بھی قابل محنتی اور مخلص کارندوں کی قدر کرنے کی خوبی سے آراستہ ہیں۔

میرے ایک دوست شیخ غلام علی اینڈ سنز میں برسہا برس تک کام کرتے رہے ہیں۔ کبھی کبھار ان سے ملنے کے لئے اُوپر جانا ہوتا تھا۔ راستے میں ملک رب نواز کا کمرہ ہے۔ ان سے سلام کئے بغیر اُوپر جانا خلافِ اخلاقِ حسنہ ہی نہیں۔ اول درجے کی حماقت بھی ہے۔ چنانچہ ہمیشہ ملک صاحب کو سلام کر کے گزرنا ہوتا تھا۔ جس کے جواب میں وہ ہمیشہ نہایت خندہ پیشانی اور شیریں لہجے میں "وعلیکم السلام" کہتے اور اکثر حال احوال بھی دریافت کرتے جب کہ اکثر یہ دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی کے دفتر سے گزرتے ہوئے اسے سلام کہا جائے تو سر پھرے افسران زیادہ سے زیادہ سر جھٹک کر سلام کا بوجھ اتار کر پھینک دیتے ہیں

ملک محمد فاضل

کشمیر کی برفانی ہواؤں کی عین زد میں واقع جڑواں گاؤں "آچھ گوچھ" میں سے آچھ کا جن تین مشہور شخصیتوں سے گہرا تعلق ہے۔ ان میں سے ایک تو ممتاز عالم دین سید اسعد گیلانی ہیں۔ دوسری شخصیت عالم لوہار کی تھی جو لوک گیتوں اپنے مخصوص انداز اور روائتی چمٹے کی وجہ سے مشہور ہوئی۔ تیسری گنوں کی پٹاری ملک محمد فاضل ہے جب وُہ اپنے آپ کو آچھوی کہتا ہے تو انجان آدمی یہ سمجھتا ہے کہ ان کو چھینک آ رہی ہے۔ ملک فاضل لوگوں کے کردار اور شکل و صورت کے مطابق نام تجویز کرنے میں بے مثل ہے۔ ایک صاحب کی لمبی ناک ہے۔ ملک صاحب سے کہا گیا کہ وہ ملے تھے۔ کہنے لگے اچھا "ہُد ہُد"۔ اتنا برمحل نام تھا کہ محفل میں ہنسی کے فوّارے چھوٹنے لگے۔ ایک دوست ہیں اُٹھ جائیں تو ان کے لئے بیٹھنا مُشکل ہے چلتے ہیں تو یوں جیسے اُنہیں دھکّے جا رہے ہیں۔ ملک صاحب نے اس کو دیکھا تو فی البدیہہ ارشاد فرمایا کہ وہ دیکھو بوری آ رہی ہے۔ ایک دوسرے دوست کو بھالو کا خطاب دے رکھا ہے۔ اور تو اور اپنے آپ کو دُبلا پتلا ہونے کی وجہ سے "تیلا" کہتے ہیں۔ غصّے میں آجائیں تو منہ سے جھاگ اور پنجابی کی لذیذ ترین مغلظات ایک ساتھ یوں اُگلنے لگتے ہیں جیسے مشین گن سے تڑ تڑ گولیاں نکلتی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی بے حد خلیق، ہمدرد اور ملنسار ہیں ہمیں ایک روز اپنے گاؤں ہمراہ لے گئے ندی نالوں کو عبور کر کے ہم کئی میل پیدل سفر کر کے وہاں پہنچے تو انکی تواضع اور مہمان نوازی نے تکان کا احساس تک نہ ہونے دیا۔

ملک یوسف عزیز

ملک مظفر عزیز علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ملک یوسف عزیز ان کے صاحبزادے ہیں۔ کسی زمانے میں "نوائے وقت" میں ہمارے کولیگ تھے۔ اور اچھے خوشنویسوں میں شمار ہوتے تھے۔ بعد ازاں کاتبِ تقدیر نے اِن کو کاتب سے "نوید بہار" کا مدیر بنا دیا اور تب سے اب تک وہ اس ماہنامے کی دل کشی میں مسلسل اضافہ کیے جا رہے ہیں۔ خطِ نسخ بھی اِن کا خوب تھا مگر نستعلیق میں بے حد اچھی کتابت کرتے ہیں البتہ اپنے ماہنامہ کی کتابت دوسرے خوشنویس حضرات سے کرواتے ہیں اور کاپیاں خود جوڑتے ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ کاپیاں اکثر لیٹ جڑتی ہیں کیونکہ دوستوں اور رفیقوں کو نہ کہنا نہیں جانتے، ان کے کاموں میں مصروف رہتے ہیں اور اپنا کام بھول جاتے ہیں۔ خود فراموشی کی یہ عادت غالباً "عشرت منزل" میں زیادہ پختہ ہو گئی ہے کہ یہ نام ہی کچھ ایسا ہے۔ یوسف عزیز کے قہقہے سے گلاب جامن اُبلتے دکھائی دیتے ہیں جو کانوں میں میٹھا میٹھا رس گھولتے ہوئے کھنکھنا کر دل و نگاہ تک جا پہنچتے ہیں۔

منہاج الدین اصلاحی

اصلاحی صاحب پُرانے اخبار نویس ہیں جنہوں نے کوہستان کی بندش کے بعد مشرکت پریس کے نام سے اپنا ذاتی مطبع کھول لیا۔ جس نے وقت کے ساتھ ساتھ کافی ترقی کی۔ پریس میں اب وہ خود بہت کم دکھائی دیتے ہیں۔ اور زیادہ کام ان کے عزیز زبیر کے ذمے ہے جو نہایت خوش اسلوبی سے اپنے فرائض سرانجام دینے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ تاہم جب کبھی صحیح اور درست اردو سننے کو طبیعت چاہتی ہے۔ میں منہاج صاحب کی تلاش میں ان کے پریس میں جا ٹپکتا ہوں۔ وہ اخبار یا کسی کتاب سے نظریں اٹھا کر انتہائی دھیمے سروں میں میٹھے لہجے میں پوچھتے ہیں "سنایئے کیا حال ہے" یہ چند لفظ ان کے گلے سے یوں برآمد ہوتے ہیں جیسے بوتل سے شہد نکلتا ہے۔ اگر کسی کو مطبع سے متعلق کام ہوگا تو بالعموم ان کا جملہ یہ ہوگا "زبیر صاحب سے بات کریں" اس جملے کا ایک ایک حرف بل کھاتا ہوا، لہراتا ہوا آپ کے کانوں میں رس گھولتا ہوا اُتر جائے گا۔ ایک روز اپنے کسی کارندے پر ناراض ہو رہے تھے مگر ان کا لب و لہجہ ناراضی کی بجائے قند گھول رہا تھا۔ جس سے اور تو اور وہ کارندہ بھی لطف اندوز ہو رہا تھا۔

مولانا ظفر محمدؒ ظفر

میرے عربی کے اُستاد مولانا ظفر محمد ظفرؔ ہیں۔ بہت عمدہ کہنے والے شاعر ہیں۔ بیک وقت عربی اور اُردو میں کہتے ہیں اور خوب کہتے ہیں۔ میں ایک بار خُونی پیچش کے عارضہ میں مبتلا ہوا تو رات کو کئی بار اپنے گھر سے اُٹھ اُٹھ کے آتے رہے اور ہومیو پیتھی دوائیاں دیتے رہے۔ بے حد حساس اور شفیق انسان ہیں۔ علم و فضل میں یکتا اور عالم بے بدل ہیں۔

بڑھاپے کی وجہ سے اب نظر پر کافی اثر ہے اور پہچاننا ان کے لئے مشکل ہے میں نے بہت قریب جا کر سلام عرض کیا تو فرمانے لگے "بڑی دیر کے بعد ملے ہو، ویسے تمہارے مضامین اور نظمیں وغیرہ سُنتا رہتا ہوں" ان کے اس جملے سے پتہ چلا کہ اب پڑھنا بھی ان کے لئے مشکل ہو گیا ہے۔ تاہم ان کی زندہ دلی آج بھی اسی طرح جوان ہے جیسے آج سے تیس برس قبل تھی۔ بے حد ہنسوڑ تھے اور ہیں پکنک وغیرہ تقریبات میں طلبہ سے گھُل مل جاتے اور ایسے ایسے دل چسپ واقعات اور کہانیاں سناتے کہ پکنک کا لطف دو بالا ہو جاتا ❊

میاں محمد اسلم

بیرون سرائے سلطان لاہور میں میاں جمال الدین مرحوم نے ٹیوب ویل مشینری بنانے کا جو سلسلہ شروع کیا تھا وُہ اِن کی زندگی میں ہی کافی ترقی پر تھا۔ اِن کے داماد ظہور صاحب نے اسے سنبھالا اور بعد ازاں اس کی کئی شاخیں ان کے بچّوں میں تقسیم ہو کر قد آور درخت بن گئیں۔ اسلم سے میری واقفیت اِن دنوں ہوئی جب وہ ابھی زیرِ تعلیم اور بے حد محنتی، زیرک اور حاضر دماغ تھا۔ جب کاروبار تقسیم ہوا اور فونڈری اس کے حصّے میں آئی تو میرا خیال تھا کہ اس کے لئے اپنے والد ماجد میاں جمال الدین کی اس قیمتی جائیداد کو سنبھالنے میں دِقّت ہو گی مگر نوعمری کے عالم میں اسلم نے نہ صرف اس کاروبار کو سنبھال لیا بلکہ چند ہی سالوں میں اسے پہلے سے کہیں زیادہ معروف کاروباری ادارہ بنا دیا۔

اسلم بچپن ہی سے مذہب سے گہرا لگاؤ رکھتا ہے۔ علمائے دین کی کتابیں اس کے زیرِ مطالعہ رہتی تھیں اور ظاہری شکل و صُورت کے لحاظ سے بھی اس نے صالح اور با اخلاق مسلمان بننے کی کامیاب کوشش کی۔ جہاں تک میں نے اسے دیکھا ہے لین دین اور کاروباری معاملات میں بھی وہ صداقت اور امانت کو پیشِ نظر رکھتا ہے اس کی قابلِ ذکر خوبی یہ ہے کہ وہ مذہب کو محض قولی حد تک ہی اپنے آپ پر وارد نہیں کرتا بلکہ اس کی حقیقی روح یعنی حقوق العباد کی بجا آوری کے لئے بھی کوشاں رہتا ہے۔

مجھے جب بھی ضرورت پیش آئی اور میں نے یہ محسوس کیا کہ اب اس بھری دُنیا میں میرا غمخوار اللہ تعالےٰ کے بعد اور کوئی نہیں تو میں اسلم کے پاس چلا گیا اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اس نے روائتی کاروباری دوستوں کی مانند کوئی بہانہ بنانے کی کوشش کی ہو چونکہ میں اشد ضرورت کے تحت ہی اس کے سامنے جاتا ہوں اس لئے میری اس سے ملاقات سال میں ایک آدھ بار ہی ہوتی ہے۔ مگر یاد اس کی ہر گھڑی میرے ساتھ ہوتی ہے ؛

میجر مرزا حسن بیگ

میجر صاحب ایڈووکیٹ بھی ہیں اور خاصے علم دوست بھی۔ تاریخ ان کا پسندیدہ مضمون معلوم ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جب کسی تاریخی موضوع پر تقریر کرتے ہیں تو وقت ان کا ساتھ نہیں دیتا۔ اسی بنا، پر میں انہیں چھ ساڑھے چھ فٹ بلند و بالا بارعب جسم رکھنے والا "انسائیکلوپیڈیا" کہا کرتا ہوں۔ اس زمانے میں ہر چیز کو ڈائجسٹ کرنے یعنی خلاصے پڑھنے کی جو عادت سی ہو گئی ہے اس سے میجر صاحب کی طویل مگر پُرمغز تقریر خاصی متاثر ہوتی ہے اور سامعین اُکتاہٹ اور بوریت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اس صورتِ حالات میں میجر صاحب کے تبحر علمی کا بھی عمل دخل ہے کہ وہ مضمون کی باریکیوں اور گہرائیوں میں اتنی دُور چلے جاتے ہیں کہ مضمون کا حق تو ادا ہو جاتا ہے مگر سامعین کی تعداد کم سے کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ لاریب یہ ایک بہت بڑا علمی و ادبی المیہ ہے۔

میجر صاحب گوناگوں خوبیوں کے مالک ہیں اختلاف رائے ہر انسان کا فطری حق ہے وہ بھی اِنسانی فِطرت کے مطابق کئی احباب سے بعض معاملات میں متفق نہیں ہیں لیکن ان کا تذکرہ انہوں نے کبھی گِرے ہوتے یا نامناسب الفاظ سے نہیں کیا۔ علاوہ ازیں ان کی حتی الامکان کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنے قول پر پُورے اتریں اگر کبھی کسی بشری مجبُوری کے تحت وہ اپنی بات کو نبھانے پر قادر نہ ہو سکیں تو اس کا انہیں بے حد احساس ہوتا ہے اور وہ اس کا برملا اظہار کرنے میں بُخل سے کام نہیں لیتے۔ خندہ پیشانی سے مِلنا، چائے کی یا کھانے کی دعوت دینا۔ دوسروں کی ضرورت کو پُورا کرنا۔ میجر صاحب کی عادات و خصائل کا قابلِ ذکر محاورہ اور عام گفتگو کو شائستہ لطیفوں سے مزین کر کے مخصوص لب و لہجہ میں باغ و بہار کا سا سماں باندھنا ان کا روزمرہ ہے۔

نثار احمد چودھری

گجرات ضلع کچہری میں ایک خوب صورت چیمبر میں نثار احمد چودھری ایڈووکیٹ کا ڈیرا ہے جہاں گجرات کے اکثر صحافی ہر صبح جمع ہوتے ہیں۔ گپ شپ لڑاتے ہیں اور ان سے سبز چائے پیتے ہیں۔ نثار چودھری نہ صرف کامیاب وکیل ہے بلکہ یارِ نازدوست اور ایک دل کش انسان ہے۔ تقریر کرتا ہے تو اپنے قد سے تین چار فٹ آگے نکل جاتا ہے۔ باتیں کرتا ہے تو دِل میں وافر جگہ حاصل کر لیتا ہے۔ بیڈمنٹن کھیلتا ہے تو "چڑیا" کے بجائے ستاروں تک اپنا ریکٹ لے جاتا ہے۔ چائے دوسروں کو پلاتا ہے اور خود بلاناغہ دودھ پیتا ہے۔ تقریر کرنے کے لئے جب کرسی سے اُٹھتا ہے تو عجیب و غریب انداز اور سٹائل سے سامنے آتا ہے۔ دونوں ہاتھ اپنی رانوں پر زور سے مارتا ہے اور چور آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھتا جاتا ہے۔ مائیک کے سامنے آتے ہی نہایت فصیح و بلیغ اور مدلّل تقریر میں جب باموقع، بامعنی اور بلند پایہ شعر لہک لہک کر پڑھتا ہے تو مائیک اُچھل کر بے اختیار اس کے سینے سے لگ جاتا ہے اور اس کی آواز کو نشر کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لے آتا ہے

نثار احمد گھر سے اپنے دفتر آنے جانے کے لئے موٹر سائیکل استعمال کرتا ہے اس کی آرام دہ نرم گدی پر بیٹھا ہوا یوں دکھائی دیتا ہے جیسے سُریلی بانگ دینے دینے والے سحر خیز کسی مُرغ کی کلغی ؀

نذیر احمد خاں

بک سنٹر میں میں تو اوپر دفتر میں بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ جب کہ نیچے کاؤنٹر پر کتابوں کی سیل اور دیگر ضروری امور نذیر احمد خاں سرانجام دیا کرتے تھے۔ خان صاحب صبح نو بجے دوکان کھلنے کے ساتھ ہی عین وقت پر آ جاتے اور خدا جانے کتنے بجے چھٹی کرتے تھے جب کہ میں چار بجے اٹھ کر گھر چلا جاتا تھا۔ جب بھی میں کسی کام سے نیچے آتا یا کرسی پر بیٹھے بیٹھے کبھی میری نگاہیں ہال میں قرینے سے سجی ہوئی کتابوں کی مخملیں جلدوں سے پھسل کر سرخ و سپید رنگت کے نذیر احمد خان پہ پڑتی تو انہیں کاؤنٹر پر یا کسی ریک کے پاس گاہکوں کے ساتھ خوش دلی سے مصروفِ گفتگو پاتا۔ متواتر کئی ماہ تک جب میں نے انہیں بیٹھنے کے بجائے محض کھڑے ہی دیکھا تو میری ٹانگوں کے پٹھے کھنچ گئے اور بالآخر مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے ان سے دریافت کیا کہ خان صاحب آپ صبح سے رات گئے تک مسلسل کتنے گھنٹے کھڑے رہتے ہیں۔ آپ انسان ہیں یا جن؟ اس پر وہ حسبِ عادت خوش دلی سے کہنے لگے کہ ذرا دیکھئے یہاں کوئی کرسی ہے؟ میں نے کہا کہ کرسی تو نہیں مگر یہ سٹول پڑا ہے۔ کہنے لگے سٹول بھی ان لاتعداد الماریوں اور ریکوں کی مانند کھڑا ہے یہاں جو گاہک آتے ہیں وہ بھی کھڑے ہوتے ہیں اور تو اور کتابیں بھی ریکوں اور الماریوں میں کھڑی ہیں۔ پھر میں کیونکر بیٹھ سکتا ہوں؟ ان کے اس فلسفیانہ جواب نے مجھے مطمئن تو نہ کیا مگر میں لاجواب سا ہو گیا۔ مطمئن نہ ہونے کی وجہ تو خیر صرف یہ تھی کہ میں ایسی کسی ملازمت کا تصور بھی نہیں کر سکتا جہاں متواتر بیس گھنٹے انسان کھڑا رہے اور یوں بے جان مشین بن کر رہ جائے۔ لیکن جہاں تک خاں صاحب کا معاملہ تھا وہ نہ تو بے جان مشین بنے نہ ان کے پٹھے دکھے اور نہ ہی انہیں بوریت یا تھکاوٹ کی شکایت ہوئی۔ البتہ جب

مجھے ان کو اور "بک سنٹر" کو الوداع کہے کچھ مدّت گزر گئی تو ایک روز وہ مجھے راستے میں اسی طرح ملے جیسے پہلے بھی کبھی کبھار آواز سے تیز رفتار جیٹ طیاروں کی رفتار میں گزرتے ہوئے مِلا کرتے تھے۔ اس روز انہوں نے باقاعدہ اپنی سائیکل کو بریک لگائی اور مجھے بتایا کہ انہوں نے شادمان کالونی میں اپنی ذاتی دوکان "بک وے" کھول لی ہے۔ مجھے یہ سُن کر از حد خوشی ہوئی کہ چلو میرے سامنے ایک ایسی مثال تو آئی کہ ایک بے حد محنتی اور دیانت دار شخص بھی اس قابل ہُوا کہ وہ اپنا ذاتی کاروبار کر سکے۔ میں خان صاحب سے ملنے کے لئے کئی بار ان کے "بک وے" میں گیا لیکن عجیب اتفاق کہ وہاں مجھے وہ نہیں مِلے۔ اب مجھے مزید معلوم ہوا ہے کہ ان کی دوکان کے ہاں کچھ عرصہ قبل ایک نئی برانچ متولد ہوئی تھی۔ اور اب انہوں نے وہاں بھی کتابوں کی سیل کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ نذیر احمد خان کا جناّتی طرزِ عمل اور طرزِ زندگی پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں ان کے لئے دُعا گو ہوں کہ اَللّٰھُمَّ زِدْ فَزِدْ ۞

نسیم ہاشمی

یہی کوئی بیس بائیس برس قبل میں رام گلی کے ایک ٹی سٹال میں بیٹھا ہوا تھا کہ "چھٹیلے" جسم کا ایک طرح دار نوجوان، انگریزی کا اخبار اور چند کتابیں اٹھاتے وہاں آیا اور اس نے آتے ہی خالص میرٹھی لہجے میں چائے کا آرڈر دیا۔ اتنے میں ایک اور نوجوان وہاں آیا اور اس نے میرٹھی سے مصافحہ کرتے ہوتے کہا "سنائیے ماسٹر صاحب کیا حال احوال ہے"۔ ماسٹر صاحب نے اس کے لئے بھی چائے منگوالی اور دونوں میں گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ باتوں کا رُخ خالص علمی بحث میں تبدیل ہو گیا۔ میرے بھی کان کھڑے ہو گئے ایک مرحلے پر میں نے ان سے کچھ کہنے کی اجازت طلب کی تو ماسٹر صاحب نے "دیدہ و دل فرشِ راہ" کرتے ہوتے مجھے اپنے قریب بیٹھنے کے لئے کہا۔ یہ ماسٹر صاحب دراصل نسیم احمد ہاشمی تھے جن سے بعد ازاں دوستی اور اخوت کا لامتناہی رشتہ استوار ہوا۔

نسیم ہاشمی بھی میری طرح ایم اے ہے اور علم و ادب کا ازحد شائق۔ موسیقی سے اسے بھی بے پناہ رغبت ہے۔ ان دنوں وہ کئی خوب صورت کلاسیکل گانے لہک لہک کر ـــــ صرف اپنے جی کو خوش کرنے کے لئے گایا کرتا تھا۔ جب میری شادی ہوئی تو کہنے لگا کہ میرے پاس بھابی کو دینے کے لئے کوئی تحفہ نہیں البتہ میں ایک گانا ضرور سنا سکتا ہوں۔ چنانچہ اس نے نہایت دل کش انداز میں جو گانا سنایا وہ یہ تھا

؎ چلی گوری پی کے ملن کو چلی

اس کے پاس پیسے شاذ ہی ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ ملنگ آدمی تھا ایک آدھ ٹیوشن کر کے سگریٹ چائے کا خرچہ نکال لیتا تھا۔ روٹی دال گھر سے اُسے مل جاتی تھی۔ اس کا کام صرف کتابیں پڑھنا، سیر سپاٹا اور ہفتے میں، مہینے بھر کی فلمیں دیکھنا تھا رات

کو ایک بجے مجھے اور اسے اکثر "دورہ" پڑتا تھا اور ہم دونوں "باغ جناح" میں گھومنے چلے جاتے تھے۔ کبھی کبھار ہمارے ساتھ نسیم کی برابر والی گلی کا اکرم یا داکرام، اور انجینئرنگ یونیورسٹی دفتر کا ایک کلرک محمد اسحاق تابش بھی ہوتے تھے یہ اکرم عمارتوں کو رنگ روغن کرنے کا کام کرتا تھا کوٹھیوں اور بنگلوں کے حوالے سے عشق و عاشقی کی من گھڑت داستانیں سنانا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔ محمد اسحاق تابش بہت مخلص دوست اور سیدھا سادہ نوجوان تھا جس کی عقل اس کے لاتعداد بچوں نے ماری ہوئی تھی۔

ایک روز خبر آئی کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل ڈاگ ہیمر شولڈ کا طیارہ کانگو میں گر کر تباہ ہو گیا ہے، رات کو جب ہم باغ جناح جا رہے تھے تو راستے میں تابش نے پوچھا "نعیم صاحب! یہ ہیمر شولڈ کانگو کیا لینے گیا تھا"، میں نے ازراہ تفنن جواب دیا کہ "کانگو میں بہت بڑی یونیورسٹی ہے اس نے ہیمر شولڈ کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری دینے کے لئے بلایا تھا۔ کہ اس کے طیارے کو حادثہ پیش آگیا۔ یہ سن کر نسیم ہاشمی کا ہنستے ہنستے دم نکل رہا تھا۔ مگر تابش، افریقیوں کی علمی ترقی پر حیران کن معلومات پیش کرکے میری تائید پہ تائید کئے جا رہا تھا۔ اگلی صبح اس نے اپنی یونیورسٹی میں بھی یہی "انکشاف" کیا تو وہاں اس پر بڑی پھبتیاں کسی گئیں مگر اس نے کوئی پرواہ نہ کی اور یہی کہتا رہا کہ "نعیم صاحب نے مجھے بتایا ہے ان کی بات غلط نہیں ہو سکتی،، جب مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو سخت ندامت ہوئی کہ ایسے مخلص دوست کو مذاق کا نشانہ بنانا مناسب نہ تھا۔

نسیم ہاشمی سیلف میڈ آدمی ہے اپنی تعلیم کو جاری رکھنے کے لئے اس نے جی پی او کراچی میں کئی ماہ تک خطوط نویسی اور اسی قسم کے چھوٹے موٹے کام کرنے میں بھی کوئی عار نہیں سمجھا۔

چند روز قبل کئی برس کے بعد وہ اچانک سرِ راہ مجھے ملا اور اس نے مجھے بتایا کہ نہ صرف اس کی شادی ہو گئی بلکہ ایک گول مٹول منّے کا ابّو بھی بن گیا ہے تو میں نے اسے کہا کہ دونوں بڑی خوشی کی باتیں ہیں کیونکہ تم نے سنا نہیں کہ "دیر آید درست آید"۔ بولا ایک تیسری خوشخبری بھی ہے! میں نے کہا وہ کیا کہنے لگا "بھائی میں گزشتہ پانچ سال سے باقاعدہ سروس بھی کر رہا ہوں"

نعیم صدیقی

ماہنامہ سیارہ کے معروف مدیر اور اچھا کہنے والے شاعر ہیں۔ میرے ساتھ ان کا تعلق عجیب و غریب ہے وہ میرے ہم نام بھی ہیں اور ہم کام بھی۔ میں نے انہیں کئی بار اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی سعادت حاصل کی ہے اور یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ ان کے چہرے پر بھی ڈاڑھی ہے اور آج سے پانچ برس قبل تک میں بھی ڈاڑھی رکھنے کا قائل تھا اور باقاعدہ ڈاڑھی رکھتا تھا۔ ایک زمانے میں جب میں مستقل طور پر ایک اخبار میں کالم لکھا کرتا تھا۔ مولانا نعیم صدیقی نے اپنے ماہنامہ سیارہ (جولائی ۱۹۶۸ء) میں حسب معمول نہایت شگفتہ رنگ میں میرے کالم کا تذکرہ کرتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ وہ لوگ (جن کی تعداد بہت کم ہے) جو یہ جانتے ہیں کہ ان کا اصل نام کیا ہے۔ وہ اس کالم کو پڑھنے کے بعد انہیں مبارکباد دیتے ہیں یا مختلف سوالات کرتے ہیں۔ ایسے "واقف حال" مگر "انجان"، دوستوں، "مداحوں" اور گلہ گزاروں کی اطلاع کے لئے انہوں نے لکھا کہ انہوں نے ہمیشہ اپنی تحریروں کو نعیم صدیقی کے نام سے چھپوایا اور کبھی اپنا پورا نام اس غرض سے استعمال نہیں کیا۔ انہوں نے "حامد کی پگڑی محمود کے سر" ضرب المثل کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا جس تحریر پر کسی کو ان کا مکمل نام نظر آئے وہ یہ سمجھ لے کہ یہ نعیم صدیقی کی تحریر نہیں ہے۔ یوں وہ حامد کی پگڑی محمود کے سر باندھنے کی زحمت سے بچ جائیں گے "۔

نعیم صدیقی جن کا ہمزاد ہونے کا شرف مجھے حاصل ہے اور جنہیں میں نے کئی بار دیکھا بھی ہے اور ان سے مصافحہ بھی کیا ہے۔ انہیں میں یہ کبھی نہیں بتا سکا کہ میں کون ہوں؟ کیونکہ اِسے میں بہرحال ایک مضحکہ خیز صورت خیال کرتا ہوں کہ

کوئی شخص اپنا تعارف اپنے ہی آپ سے کروانے لگے۔ البتہ میری یہ خواہش ضرور رہی ہے کہ جب میرا اور ان کا نام اور کام ایک جیسا ہے تو یہ پتہ چلانا چاہیے کہ کیا مقدر میں بھی یکسانیت ہے یا ان کے ستارے اور ہیں اور میرے اور؟ ابھی تک میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی۔ شاید آئندہ اس کی کوئی سبیل نکل آئے

"نونِ غنّہ"

رفیق قریشی میرا ناقابلِ فراموش دوست ہے۔ بہترین آرٹ ایڈیٹر ہے۔ جب پیدل ہوتا تھا تو روزانہ ملتا تھا۔ اب موٹر سائیکل پر ہے۔ لہٰذا کبھی نہیں ملا۔ "وہ اور میں" کی کاپیاں جوڑتے وقت بہت یاد آیا۔ ارشد نے چودہ کاپیاں تیار کیں اور غائب ہوگیا۔ باقی ۱۷، ۱۸ کاپیاں میں نے خود جوڑلیں۔ جیسا ٹائیٹل بنواتے وقت ہوا۔ آرٹسٹ صاحب غائب ہوگئے تو ٹائیٹل بھی میں نے خود بنالیا اب کتاب چھپ کر سامنے آئے گی اور ٹیڑھی میڑھی سطریں دیکھ کر قارئین مجھے دوش دیں گے تو رفیق قریشی پھر یاد آئے گا۔

نیاز احمد نیازی

"جنگ" کا نمائندہ خصوصی ہے۔ ریوالور کی چھ گولیاں جو دو گز کے فاصلے سے اس پر چلائی گئی تھیں ان میں سے پانچ وہ ہضم کر چکا ہے۔ البتہ آج بھی ایک گول جسم کے کسی ایسے حصے میں محفوظ ہے۔ جہاں سے ڈاکٹر نکالنے پر قادر نہیں ہوتے۔ پانچ گولیوں میں سے ایک گولی عین دل کے اوپر لگی تھی۔ ہسپتال میں اچانک کھانسی آئی تو دل نے اسے یہ کہتے ہوئے منہ کے راستے باہر اچھال دیا کہ کم بخت تیرا دل میں کیا کام ؟ تحصیل پھالیہ کے مخصوص لہجے میں ہزاروں لطیفے یاد رکھنا اور ان کو بیان کرنا نیازی کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بے حد محتاط مگر نڈر آدمی ہے پنجاب پولیس کے تمام بڑے چھوٹے افسروں کو ذاتی طور پر جانتا ہے جب کہ ایک جیسی مخصوص وردیوں میں چاند تارے والے تین چار افسروں کو بھی یاد رکھنا میرے جیسے کوڑھ مغز کے بس کی بات نہیں۔ سفر کرنے کے معاملے میں گردشِ زمانہ سے بھی چار قدم آگے ہے۔ صبح راولپنڈی گیا ہوگا تو شام کو چیچو کی ملیاں۔ وہاں سے فیصل آباد اور وہاں سے ملک وال۔ ملک وال سے پتہ چلے گا کہ رات نو بجے آیا تھا۔ دس بجے منڈی بہاء الدین چلا گیا۔ مگر ملے گا لاہور میں۔ جہاں صرف دو گھنٹے ٹھہرنے کے بعد اس کے گجرات چلے جانے کی اطلاع ملے گی۔

جب بھی ملے گا تو یوں محسوس ہوگا گویا بچھڑے ہوئے خوابوں میں مل رہے ہیں کاغذ یا پلاسٹک کا "بریف کیس" کھولے گا۔ پندرہ بیس ٹوٹے نکالے گا

خبروں کے خلاصے درج ہوں گے۔ قتل کی، اغوا کی، سزا کی۔ رہائی کی۔

نعیم صاحب! دیکھنا ذرا خبر ٹھیک ہے۔ انٹرو مناسب ہے" جب تک اس کی تسلی نہیں ہوگی۔ جان نہیں چھوڑے گا۔ اپنا گلا خراب ہو تو راجہ طارق سے خبریں لکھوائے گا ورنہ فون پر ایسے شیریں لہجے میں بات کرے گا کہ بور سے بور نیوز ایڈیٹر بھی کاغذ قلم سنبھالنے پر مجبور ہو جاتے گا خبر لکھواتے وقت ذومعنی یا مشکوک قسم کی عبارت یا ناموں کی وضاحت کرے گا تو لکھنے والے کی طبیعت خوش ہو جائے گی مثلاً اگر خبر میں اغوا ہونے والی لڑکی کا نام ملکہ ہوگا تو کہے گا "آجی جیہڑی برطانیہ وچ لگی پھردی اے" پولیس کے کارناموں کی خبریں اگر بازیافت چیزوں کی تعداد چار صد چھہتر ہوگی تو بتاتے گا "جی اینہوں انگریجی وچ سیون ٹی سکس آکھدے نیں" اپنے علاقے کے لوگوں، دوستوں اور واقف کاروں کے درجنوں کاموں کے سلسلے میں صبح سے شام تک بلا معاوضہ انتظامیہ اور پولیس کے دفاتر میں بھمبیری کی مانند چکر لگاتے گا۔ آج کل گجرات کے صحافیوں کی انجمن کا صدر ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ سوائے ایک دو صحافیوں کے سب ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے ہیں کیونکہ نیازی ضلع بھر میں واحد شخصیت ہے جس کی ذات میں کوئی کیڑے نہیں نکال سکتا۔

یٰسین بٹ بہادر

یٰسین بٹ روزنامہ "وقت" کے مدیر اعلیٰ اور مالک ہیں بے حد سادہ منکسر المزاج اور صحیح معنوں میں خاکسار ہیں۔ اُصولوں اور ضابطوں پر سختی سے پابندی کرتے ہیں اپنا روزنامہ اِن دنوں میں بھی شائع کر لیتے ہیں جب مالی حالات سخت دگرگوں ہوتے ہیں۔ عمر میں کتنی برس چھوٹے اور تجربے میں اپنے سے کہیں کم احباب کو ملتے ہیں تو انہیں بے پایاں محبت و شفقت سے سر آنکھوں پر بٹھا لیتے ہیں۔ بات کرتے ہیں تو اتنی دھیمی آواز میں کہ آپ بھی نہ سُن پائیں۔ مگر جب اصول اور ضابطے کی خلاف ورزی کہیں دیکھ پائیں تو یٰسین بٹ بہادر بن جاتے ہیں۔ ایک بار جب کہ مجھے بھی پیسوں کی اشد ضرورت تھی اور بٹ صاحب کو بھی کہ شاید اس روز اخبار کے لئے کاغذ لانا تھا کہ میں ایک پارٹی سے اشتہار اور اس کی رقم لے آیا جو ہم دونوں کی ضرورت کے لئے اس روز کفایت کر جاتی۔ بہت خوشی کا اظہار اور بار بار میرا شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے اشتہار دیکھا تو یکایک اسے چھاپنے سے معذرت کر دی۔ میں بہت حیران ہوا، پتہ چلا کہ کسی زمانے میں اس پارٹی کا بٹ صاحب سے کسی اُصولی معاملے میں اختلاف ہو گیا تھا۔ میں نے کہا جناب وہ اپنے مؤقف میں نظر ثانی کر چکے ہیں فرمانے لگے "ٹھیک ہے وہ نظر ثانی کر سکتے ہیں۔ مگر ہمارے لئے ایسا کرنا ممکن نہیں"

لین دین کے بہت کھرے اور صاف ہیں۔ باقی معاملات میرے مشاہدات میں نہیں آئے مگر "شرکت پروسس" جہاں سے وہ اخبار کے لئے پازیٹو بنواتے ہیں

وہاں میں نے دیکھا ہے کہ بٹ صاحب آئیں گے۔ ایک ماہ، دو ماہ یا جیسا بھی ان کا دستور العمل ہے اس عرصے کا حساب وہ نہایت احتیاط سے چیک کریں گے اور ایک ایک پیسہ ادا کر کے سرخرو ہوں گے۔ شاکر نے مجھے بتایا کہ بٹ صاحب کو یاد دہانی کرانے کی شاذ ہی ضرورت پیش آتی ہے۔

بٹ صاحب کسی سے ناراض ہونے کے لئے کافی سوچ بچار کرتے ہیں کیونکہ جب وہ ناراض ہو جاتے ہیں تو اِن کو پھر سے راضی کرنا جُوئے شیر لانے کے مترادف ہوتا ہے اس لئے میری ہمیشہ یہ خواہش، کوشش اور دعا رہی ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہ ہوں کیونکہ صحافتی، علمی، ادبی اور مجلسی خدمات کے لحاظ سے وہ بے حد مُوقّر انسان ہیں۔

یونس بخاری

محمد یونس بخاری ۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے عزیزوں میں سے ہے۔ نعت بہت اچھی کہتا ہے۔ سکول ماسٹری راس نہ آئی تو اسے چھوڑ کر روڈ انسپکٹری کر لی۔ اور اس میں استقلال کا پروانہ حاصل کر لیا۔ سخت غصے کے عالم میں جس شخص کو گریبان سے پکڑ کر دو چار گھونسے لگانے کی قسمیں کھا کر اٹھے گا۔ اس کے سامنے جاتے ہی مسکرا کر اسے ملے گا اور اس سے خوب خوب معانقہ کرے گا۔ واپس آئے گا اور پوچھنے سے پہلے ہی بتانے لگے گا کہ میں نے اسے اتنی کھری سنائی ہیں کہ اس کی نسلیں بھی یاد رکھیں گی۔ انتقام سے زیادہ عفو و درگذر کا قائل ہے بلکہ عفو ہی کو سب سے بڑا انتقام قرار دیتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے نانا کے اسوۂ حسنہ لاتثریب علیکم الیوم پر سختی سے عمل کرنے کی کوشش میں لگا رہتا ہے۔ اس کی جیب اکثر خالی ہوتی ہے مگر جب کبھی کوئی موقع میسر آجائے۔ دوستوں کے حقوق ادا کرنے کی فکر کرتا ہے۔ ویسے بالعموم اپنی نرمی اور ظاہری رکھ رکھاؤ کی وجہ سے مخلص دوستوں کو ناراض کر لیتا ہے۔ اگر اس سے کہا جائے کہ شاہ جی یہ بات فلاں کو نہیں بتانی تو سب سے پہلا کام یہ کرے گا کہ فلاں کو ساری بات بتا دے گا اور لطف کی بات یہ ہے کہ جس دوست نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا ہوگا۔ بواپسی ڈاک اسے بھی مطلع کر دے گا کہ بات وہاں پہنچ گئی ہے نعت گوئی کے علاوہ خوب صورت غزلیں بھی کہتا ہے:

بے چینیوں میں امن کا جلوہ دکھائی دے
اب تو پرانے دیس کا نقشہ دکھائی دے
کچھ اس طرح سے کی ہے فسوں کاری وقت نے
ہر شخص اپنے آپ میں الجھا دکھائی دے

کتاب پریس میں تھی

اور طوطے اڑ گئے ....

"طوطے اُڑنا" اردو محاورے میں اچھے معنوں میں مستعمل نہیں ہوتا۔ مگر آج میں نے اور بیسیوں دیگر افراد نے اپنی آنکھوں سے جو طوطے اُڑتے دیکھے انہوں نے سب حاضرین پر رقت سی طاری کر دی۔ ایک نوعمر لڑکا دو بڑے بڑے پنجروں میں طوطے اور چڑیاں بیچ رہا تھا۔ سخت سرد ہوا کی وجہ سے کئی چڑیاں مر گئی تھیں اور باقی ٹھٹھر کر مرنے کے قریب تھیں۔ طوطوں کی حالت ان سے کچھ بہتر تھی مگر وہ بھی موت کے دروازے پر دستک دے رہے تھے۔ ناگاہ ایک شخص نے اپنی کار نمبر ۹۲۹ LEM روکی اور لڑکے کو اپنے پاس بلایا نیچے اتر کر اس نے قیدیوں کا بغور معائنہ کیا۔ ان کی حالت زار پر وہ اس قدر متاثر ہوا۔ کہ تمام چڑیوں اور طوطوں کی قیمت چُکا دی۔ ایک ایک کر کے جب یہ بے زبان پرندے فضا میں اچھالے گئے تو ان میں سے چند ایک نے جن میں اڑان کی مکمل سکت تھی رہا کرانے والے کو باقاعدہ سلامی دی۔ آزادی کا جو مفہوم اور واضح عملی شکل آج نظر آئی وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی

باب الابواب

ALPHABE-TICALLY

ا

ب

پ

ٹ

ث

ج